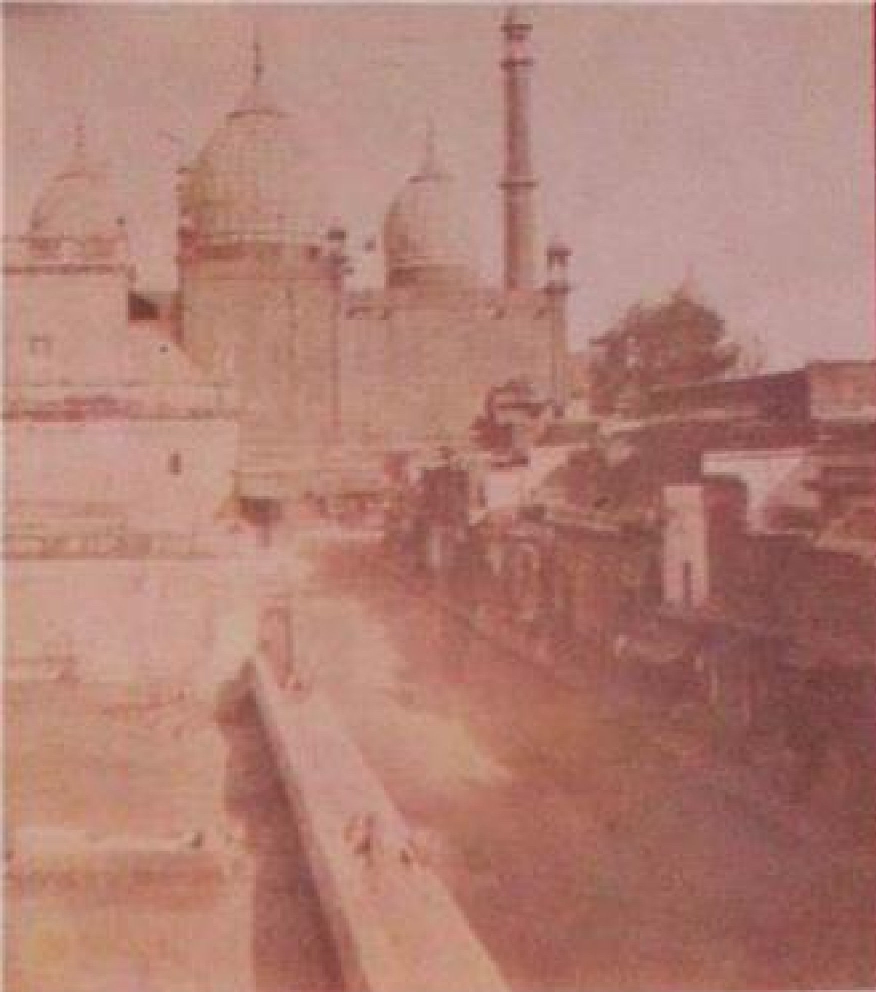


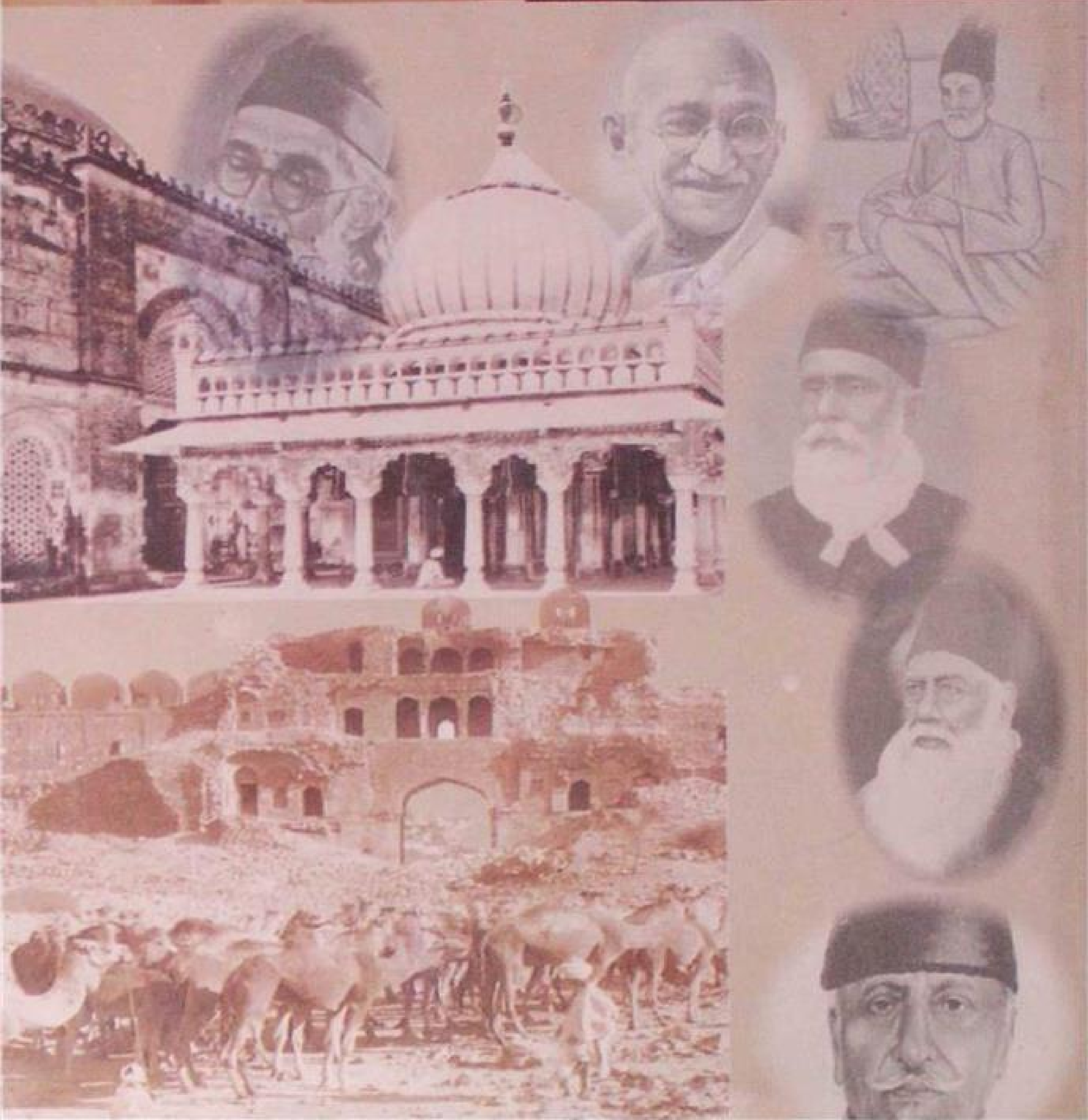
دلّی

نقوش وتاثّرات

رشحاتِ قلم بابت دلّی

از تصانیف: مولانا عبدالماجد دریابادی

ترتیب: عبدالعلیم قدوائی



دلّی: نقوش وتاثرات

رشحاتِ قلم بابت دلّی

از تصانیف

مولانا عبدالماجد دریابادی

ترتیب

عبدالعلیم قدوائی

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۹۱

DILLI: NUQOOSH-O-TAASSURAAT

Selected writings (about Dilli) of

Maulana Abdul Majid Daryabadi

Edited by

Abdul Aleem Qidwai

Pub.by

URDU ACADEMY, DELHI

Print
2013
Rs. 120.00

ضابطہ

سنِ اشاعت
۲۰۱۳ء

ایک سو بیس روپے

شوبی آفسیٹ پریس ۲۸۱۸، گلی گڑھیا، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-195-X

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجاطور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پاکر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کررہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہوگئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں،

شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

''دلّی: نقوش و تاثرات'' بزرگ و محترم دانشور و ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے رشحاتِ قلم پر مبنی ہے۔ انھوں نے اپنے رسائل وغیرہ میں دلّی یا دلّی کی نامور و ممتاز شخصیات سے متعلق جو مضامین و تبصرے وغیرہ لکھے ہماری گزارش پر پروفیسر عبدالعلیم قدوائی نے بڑی محنت و جانفشانی سے یکجا کیے اور مرتب کیے۔ چوں کہ پروفیسر قدوائی مولانا عبدالماجد دریابادی کے خانوادے کے لائق و فائق چشم و چراغ ہیں اس لیے موصوف نے پوری عقیدت کے ساتھ اس وقت طلب کام کو کیا، ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب دلّی کی بازیافت میں ایک اہم دستاویز ثابت ہوگی اور دلّی کی تاریخ و تہذیب کے طالب علموں کے لیے مفید و کارآمد ہوگی۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

انیس اعظمی

سکریٹری

دیباچہ

دلّی اور اس کے رہنے والوں کو ادبی و ثقافتی لحاظ سے ملک میں مرکزیت حاصل ہے اور اردو اور اس کے ادیبوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ حال ہی میں میرے کرم فرما ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی، ڈائریکٹر یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج، علی گڑھ جو اردو کے نامور ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی کے نواسے ہیں، سے ایک ملاقات میں یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ مولانا دریابادی نے دلّی اور اس کے مشاہیر کے متعلق نقوش و تاثرات اپنی کتابوں، اخبارات، نشری تقریروں، کتابوں، تبصروں اور پیاموں کی شکل میں قلمبند کیے ہیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے والد محترم جناب عبدالعلیم قدوائی صاحب، مرکزی حکومت کی اکنامکس سروس کے سبکدوش افسر، کے پاس مولانا مرحوم کی تصنیفات اور سچ، صدق اور صدق جدید کی مکمل فائلیں موجود ہیں اور وہ ان کی کئی کتابوں کو مرتب بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ میں نے موصوف سے درخواست کی کہ وہ ان تمام تحریروں کو کتابی شکل میں مرتب کریں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ محترم قدوائی صاحب نے ایک دلچسپ اور جامع کتاب دلّی: نقوش و تاثرات - انتخاب از تصانیف مولانا عبدالماجد دریابادی سلیقہ اور محنت سے مرتب کر دی۔ کتاب حسب ذیل پانچ ابواب پر منقسم ہے:

باب اول — تعارف:

جس میں انھوں نے بڑی جامعیت سے مولانا کے دلّی اور اہل دلّی کے تعلقات کو بیان کیا

ہے۔ وہ مولانا کے حقیقی بھتیجے اور داماد ہیں، ان کے بہت نزدیک رہ چکے ہیں۔ دہلی کے کئی سفروں میں ان کے ہم رکاب بھی رہے اور ان کی تحریروں، مزاج اور تاثرات سے بخوبی واقف اور آگاہ ہیں۔ مولانا محمد علی، ہمدرد، گاندھی جی اور ان کے برت، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء، سعودی، شریفی آویزش وغیرہ کے معتبر حالات اس میں مجمل طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ جامعہ ملیہ، درگاہ نظام الدین، ہمدرد دواخانہ اور شاہجہاں آباد کی مٹتی ہوئی تہذیب اور رائے سینا کی جگمگاتی خیرہ کن تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

باب دوم — مشاہیر دہلی:

دلّی کے بزرگان دین، علماء، شعراء، نثر نگاروں، صحافیوں، سیاست دانوں اور مشہور شخصیتوں کے بارے میں مولانا کے خاکے، ریڈیو نشریے اور تاثرات شامل ہیں جو ادبی اعتبار سے بڑے دلچسپ اور دلکش ہیں۔

باب سوم — دلی کے سفرنامے:

اس میں مولانا نے دلّی کے تین سفروں کی روداد اپنے منفرد شگفتہ و دلآویز اسلوب میں بیان کی ہے جس سے دلّی اور دلّی والوں کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اپنے متقدمین سے لے کر معاصرین تک کا احاطہ اردو کے ادیب اعظم نے بڑی جامعیت اور تاثر سے کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی جامعہ ملیہ، لال قلعہ، جامع مسجد، شاہجہاں آباد، انجمن ترقی اردو، نیشنل آرکائیوز اور نئی دہلی کی جگمگاتی تہذیب کا ذکر سچائی، جذب اور دل کی گہرائیوں سے نکلے جذبات اور انتہائی مناسب اور شستہ الفاظ میں کیا ہے۔

باب چہارم — دلی کے اہل قلم کی کتابوں پر تبصرے:

دلّی کے اہل قلم کی کتابوں پر مختصر مگر جامع تبصرے جو مولانا نے اپنے مؤقر جریدہ صدق اور صدق جدید میں کیے ہیں یکجا کر کے پیش کیے گئے ہیں اور اپنے تنوع، ادبی لطافت و نفاست کے اعتبار سے اردو کی اعلیٰ تنقیدات میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

باب پنجم: دلّی سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام مکتوبات، پیامات اور شذرات:

بحیثیت مکتوب نگار مولانا کو اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اختصار، ایجاز حسن انشاء کا بہترین نمونہ، طلب علم کی لگن، صحیح لغت و زبان کا استعمال اور شگفتگی سے معمور یہ انتخاب بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

مولانا دریابادی، اہل زبان اور مسلم ادیب و انشا پرداز تھے جنھوں نے ایک شگفتہ اسلوب ایجاد کیا جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ان کی قلمی تصویریں خاکے، مکتوبات اور پیامات سب میں حسن انشاء، غضب کی روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو لغت و محاورہ پر ان کو کتنا عبور حاصل تھا اور مکتوب نگاری، خاکہ نگاری، نثریات میں ان کا مقابل یا ثانی ملنا دشوار ہے۔

اس لحاظ سے یہ میری اور اردو اکادمی، دہلی کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی دلچسپ اور ادبی لحاظ سے نہایت قیمتی کتاب منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

امید ہے قارئین اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

پروفیسر اختر الواسع

وائس چیئرمین، اردو اکادمی، دہلی

باب اول

تعارف

دلی کی تاریخی، ثقافتی اور ادبی عظمت اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ مدتوں سے ہندوستان کی سیاسی حکمرانی، علمی، ادبی اور تمدنی سرگرمیاں اور دنیا میں براعظم صغیر کی نمائندگی یہی شہر کر رہا ہے، اردو اور مسلمانوں کا اس سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ملک کے نامور عالم، صاحب طرز ادیب اور باکمال صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کو بچپن ہی سے دہلی سے انسیت اور دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہاں کے شعراء، نثرنگار، عالموں اور طبیبوں کی عظمت کا سکہ ان پر بیٹھ گیا۔ اعلیٰ تعلیم، فلسفہ میں ایم۔اے۔ کرنے کے لیے وہ پہلے محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے مگر وہاں کے کورس مختلف ہونے اور لائق استاد نہ ملنے کی وجہ سے وہاں صرف ایک سال ہی رہے اور پھر رائے دلی میں پڑھنے کی قائم کی جہاں مسیحیوں کا سینٹ اسٹیفنس کالج خاصی تعلیمی شہرت رکھتا تھا، پرنسپل اور استاد دونوں نیک نام تھے اور بڑی بات یہ کہ مشہور انگریز پادری سی ایس اینڈریوز بھی وہیں رہ رہے تھے۔ چنانچہ اگست 1913 میں وہ دہلی گئے، کالج کے ہوسٹل میں کمرہ مرضی کے مطابق ملا۔ اینڈریوز صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر ان کا جی خوش ہوا اور اپنے استاد مسٹر شارپ سے بھی اچھا اثر قبول کیا اور پڑھائی شروع ہوئی مگر بدقسمتی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے جس کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ پائے اور واپس لکھنؤ چلے گئے چنانچہ اس سلسلہ میں آپ بیتی میں لکھا'' ...... سلسلہ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر دہلی سے واپس لکھنؤ آگیا اور دل کو یوں سمجھا لیا کہ جو

علمی منزلت ایم۔اے۔ پاس کر کے حاصل ہوتی وہی میں برس دو برس میں فلسفیانہ مضامین لکھ لکھ کر گھر بیٹھے حاصل کرلوں گا۔ کیا انسان ضعیف البیان اور کیا اس کے حوصلے اور ارادے۔ اگر کہیں تعلیم مکمل ہوگئی ہوتی تو زندگی کا رخ آج سے کتنا مختلف ہوتا''۔ اس کے بعد دہلی سے ان کا تعلق مولانا محمد علی، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی اور حضرت نظام الدین اولیاء کی وجہ سے برابر بڑھتا رہا۔

1912 میں مولانا محمد علی جوہر کا اردو روزنامہ ہمدرد بڑی آب وتاب سے نکلا۔ شروع 1912 تھا کہ مشہور فلسفی مِل کی کتاب 'لبرٹی' کے کچھ ابواب کے ترجمے بھیجے جو ہمدرد میں شائع ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہمدرد بند ہوگیا، مگر اکتوبر 1924 میں مولانا محمد علی نے کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد کو دوبارہ دہلی سے نکالا اور مولانا دریابادی کو صلاح ومشورے کے لیے دہلی طلب کیا چنانچہ اس تعلق سے دہلی ہر دوسرے تیسرے مہینہ کا سفر لازم سا ہوگیا۔ ہمدرد کے لیے شذرے، مقالے، مراسلے نہ معلوم کتنے لکھ ڈالے اور مولانا محمد علی کی غیر حاضری میں پرچہ کی نگرانی بھی انہی کے سپرد رہی۔

تعلیم ختم ہونے کے بعد ترجموں اور تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو اور اس کے سکریٹری بابائے اردو مولوی عبدالحق سے تعلقات قائم ہوئے اور انجمن کے پرچے ہماری زبان میں بھی مراسلے ومقالات شائع ہوتے رہے۔ حضرت نظام الدین سے عقیدت، مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد سے گہرے تعلق، دہلی کی شخصیتوں سے ملنے اور مختلف اداروں اور خود دہلی کی سیر کے لیے انھوں نے دہلی کے متعدد سفر کیے جن کے تاثرات ان کے سفرناموں میں شامل ہیں۔ مولانا کی زندگی کے چند سال الحاد وتشکیک میں گزرے۔ مذہب کی طرف واپسی کے دوران کچھ عرصہ تصوف، مزارات پر حاضری اور عرسوں کی شرکت میں بھی گزرا۔ خصوصی ارادت ونسبت حضرت نظام الدین اولیاء دہلی سے قائم ہوئی اور اس سلسلہ میں دلّی کی مشہور شخصیت خواجہ حسن نظامی کے مہمان رہا کیے۔ خیالات میں تبدیلی آنے کے باوجود بھی حضرت نظام الدین اور حضرت امیر خسرو سے عقیدت بدستور قائم رہی اور سفر دہلی کے موقع پر وہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے برابر وقت نکالتے تھے۔ اسی طرح حضرت بختیار کاکیؒ سے بھی عقیدت تھی۔

مولانا محمد علی جوہر سے تعارف اور اس کے بعد مراسلت شروع ہو چکی تھی لیکن پہلی ملاقات کا موقع دہلی میں 1914 میں رمضان کے مہینہ میں ملا۔ جب وہ ایک ذاتی غرض، محکمہ ریلوے میں ملازمت کے لیے ان کے ایک دوست شیخ ولایت علی بمبوق کا سفارشی خط لے کر ان سے ملنے دہلی

گئے، اس زمانے میں مولانا محمد علی کوچہ چیلان میں مقیم تھے جہاں ہمدرد اور کامریڈ کے دفتر بھی واقع تھے۔ اس حاضری کا ذکر انہی کی زبانی پیش ہے:

"... کمرہ معمولی سا، بجز ایک مختصر سیتل پارٹی کے ہر قسم کے فرنیچر سے معرا، نہ میز نہ کرسی نہ کوچ نہ صوفے، اس جانماز نما سیتل پارٹی پر ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کا کرتا پاجامہ پہنے کامریڈ کا ایڈیٹر جامع مسجد کے انتظامات سے متعلق گفتگو میں سرگرم، میں کامریڈ کا پڑھنے والا اور محمد علی کی آکسفورڈ ڈگری سے مرعوب اس سادگی، اسلامیت اور مشرقیت کا تصور ہی نہ کرسکتا تھا۔ بمبوق مرحوم کا خط پڑھ کر اور ملتفت ہوئے باوجود خود روزہ دار ہونے کے مجھ سے دوپہر کے کھانے کے لیے اصرار کیا اور روکتے رہے۔ اس سادگی اور اخلاص کی مثالیں کمتر ہی ملیں"۔

1924 میں مولانا محمد علی نے دہلی سے دوبارہ کامریڈ اور ہمدرد نکالنے کا فیصلہ کیا اور مولانا دریابادی کو اصرار سے عملہ کے تقرر اور دیگر معاملات میں مشورہ کے لیے دہلی طلب کیا چنانچہ ستمبر 1924 میں وہ دہلی پہنچے، وہاں معلوم ہوا کہ گاندھی جی آئے ہوئے ہیں اور مولانا کے مہمان ہیں، چنانچہ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"... گاندھی جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے کبھی اور کیوں نصیب ہوتا، اس وقت مولانا کے طفیل سے مفت مل رہا تھا۔ 18 ستمبر کو جامعہ ملیہ کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہو رہا تھا کہ منیجر ہمدرد پریس نے آکر اطلاع دی کہ گاندھی جی نے یک بیک 21 دن کے برت رکھنے کا عزم کرلیا ہے، خبر سنتے ہی سب سناٹے میں آگئے اور مولانا پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ جلدی جلدی ہم لوگ گھر پہنچے۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، آصف علی اور خود مولانا نے اپنی والی کوشش گاندھی جی کو اس عزم سے روکنے کی کی مگر وہاں تبدیلی کی گنجائش کہاں۔ سب سے زیادہ مضطرب حیران و پریشان خود مولانا تھے پہلے روئے پھر بگڑے، بار بار کہتے ہم لوگوں سے بالکل راز رکھ کر اتنی سخت کارروائی کر گزرنا تو دھوکا دینا ہوا۔ اگر اتنا سخت مجاہدہ آپ جھیل نہ پائے تو ساری ہندو قوم کا غصہ مسلمان قوم پر اترے گا کہ مسلمان میزبان نے اپنے مہمان کو مرجانے دیا۔ گاندھی جی مسکرا کر ٹھنڈے

لہجہ میں بولے، اب تو خدا کے سامنے عہد کر چکا ہوں۔ مولانا نے تڑپ کر جواب دیا ''جو عہد ہمارے مشورہ کے بغیر کیا جائے وہ عہد ہی کب ہوا''۔ پھر مولانا نے اپنی والدہ بی اماں سے گاندھی جی کے پاس پیام بھجوایا کہ تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو تو میرا حکم ہے کہ اپنے اس ارادے سے باز آجاؤ۔ گاندھی جی نے جواب میں کہلوایا ''اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس بارے میں کرسکتا تو آپ کی بات بھی ضرور مان لیتا''۔ مولانا کی مصروفیت اس تازہ واقعہ سے اور بڑھ گئی۔ میرا قیام اب بیکار تھا اس لیے میں نے وطن کا راستہ لیا''۔

اس کے بعد بھی تھوڑے عرصہ کے بعد ہمدرد کے سلسلہ میں مولانا کا جانا دہلی برابر ہوتا رہا۔ دہلی جغرافیائی حیثیت سے مرکزی مقام تو تھا ہی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری اور اس سے بڑھ کر خود مولانا محمد علی جیسے زبردست اور مرکزی شخصیتیں یہیں موجود تھیں اور اس وجہ سے مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے زیادہ تر دہلی میں ہوتے جس میں شرکت کے لیے ہر دوسرے تیسرے مہینہ مولانا کے پھیرے دہلی کے ہونے لگے۔ فروری/ مارچ 1926 میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ حکیم اجمل خاں کے مکان پر ہوا جس میں شرکت کے لیے مولانا دریابادی دہلی گئے۔ اس زمانے میں سلطان ابن سعود فرمانروائے حجاز کی تائید و مخالفت میں ملک میں بڑا جوش پھیلا ہوا تھا۔ اس کا حال مولانا نے یوں لکھا:

> ''...محمد علی آج کل زیادہ بیمار ہیں اور ایک کوچ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ جلسہ میں کسی فیصلہ سے ناراض ہو کر پنجاب کے ممبران، جس میں مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار اور ان کے صاحبزادے اختر علی خاں اور زمیندار کے نفس ناطقہ مہر صاحب شامل تھے، نے واک آؤٹ کرنا چاہا۔ ادھر ان تینوں صاحبان کا اٹھنا تھا کہ محمد علی جھٹ اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے 'غضب ہوا! باپ بیٹے اور روح القدس تینوں خفا ہو گئے'۔ یہ نمونہ تھا مولانا کی برجستگی اور حاضر دماغی کا''۔

دہلی میں خلافت کمیٹی کے ایک جلسہ میں مولانا دریابادی کی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے ہوئی جو جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل نامزد ہوئے تھے، چنانچہ پھر جامعہ کے تعلق سے بھی مولانا کا دہلی آنا جانا ہونے لگا۔

1928 میں مولانا محمد علی علاج کی غرض سے یورپ گئے اور ہمدرد کی نگرانی مولانا دریابادی

کے سپرد کر گئے۔ اس زمانے میں وہ کئی کئی دن قیام کے لیے دہلی آتے اور ہمدرد کے عملہ سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ مولانا محمد علی کے ملنے والے متعدد اور مختلف مکتبۂ فکر کے ہوتے تھے جن کی ملاقات سے وہ بھی مستفید ہوئے جس کا اعتراف انھوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔

مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد ان کا دلی کا آنا جانا کم ہو گیا۔ پھر بھی ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبہ سے ملنے، ریڈیو کی ایڈوائزری کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کرنے یا کچھ اور ضرورتوں کے لیے وہ یہاں آیا کرتے اور اس کا ذکر اپنے اخباروں میں کرتے۔ ان کے سفر نامے اپنی شگفتگی، تنوع اور جامعیت کی بنا پر پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کا ذکر باب سوم میں خاص طور پر کیا گیا ہے۔

دہلی کے جن افراد اور اداروں سے ان کے تعلقات امتداد زمانہ سے بڑھتے گئے اس کی فہرست خاصی طویل ہے، جن میں سے چند نام یہاں بطور مثال پیش ہیں: بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، مولانا محمد علی جوہر اور ان کا روزنامہ ہمدرد، خواجہ حسن نظامی اور آستانۂ حضرت نظام الدین اولیاء، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، علامہ راشد الخیری، ملا واحدی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے خاندان والے، سید ہاشمی، خواجہ محمد شفیع، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، شفیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر تاراچند، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، حکیم عبدالحمید، جگن ناتھ آزاد، گوپال متل، مرزا فرحت اللہ بیگ، اشرف صبوحی، پنڈت برج موہن، دتاتریہ کیفی، منشی گوپی ناتھ امن، منور لکھنوی، گلزار زتشی، نثار احمد فاروقی، گوپی چند نارنگ، ساغر نظامی، دیوان سنگھ مفتون، مولانا عثمان فارقلیط، رشید حسن خاں، حاجی محمد شفیع (پیکارڈ واچ کمپنی)، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ہمدرد دواخانہ اور اس کے متعلقہ ادارے، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی ہند، تبلیغی جماعت وغیرہ۔

اپنی کتابوں آپ بیتی، محمد علی ذاتی ڈائری، معاصرین اور وفیات میں جا بجا دہلی کا ذکر کیا ہے نیز اپنے مکتوبات، ریڈیو نشریوں اور شذرات میں دہلی والوں کو محبت و احترام سے یاد کیا ہے، وہاں کے مشہور اہل قلم کی کتابوں پر تبصرے اپنے مخصوص اور البیلے انداز میں کیے ہیں۔

اردو ادب میں وہ دہلی کے شعراء، نثر نگاروں اور اہل زبان حضرات کی خدمات و کمالات کے بڑے معترف تھے اور محاورہ لغت و زبان کے معاملہ میں دہلی کو مستند اور معتبر مرکز تسلیم کرتے

تھے۔ دہلی کے بہت سے اخبار و رسائل مثلاً الجمعیۃ، ملت، وحدت، الامان، دعوت، ریاست، منادی، عصمت، بنات، تحریک، برہان وغیرہ ان کے پاس پابندی سے آتے تھے اور وہ دلی کے ادبی، علمی اور صحافتی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مدرسہ امینیہ اور دیگر دینی مدارس سے ان کے خاص روابط تھے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ان کی تحریروں اور اخبارات میں ہوتا رہتا تھا۔

دلی سے مولانا کا ایک نسبی و خاندانی تعلق بھی تھا، ان کے مورث اعلیٰ قاضی معز الدین صاحب سلطنت دہلی کے زمانہ میں ملک روم سے ہندوستان تشریف لائے۔ ان کے علم و فضل کی بنا پر انھیں قدوۃ الدین والعلم کا خطاب مرحمت ہوا جس کی وجہ سے عرف عام میں ان کا نام قاضی قدوۃ پڑ گیا۔ انھیں اجودھیا جو اس زمانہ میں ایک اہم انتظامی مرکز تھا کا قاضی القضاۃ بنا کر بھیجا گیا جہاں ان کا مزار تھا جو بابری مسجد کی شہادت کے حادثہ میں برباد ہو گیا۔

دہلی کی تاریخی عمارتوں، لال قلعہ، جامع مسجد، بزرگان دین اور حکمرانوں کے مقبروں سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور ان کے حوالہ سے عبرت و موعظت، حکمت کے سبق اکثر اپنے ہفتہ وار اخبارات میں دیا کرتے۔ جامع مسجد، اس کی سیڑھیوں کی دکانوں اور خاص کر وہاں کے اشتہا انگیز اور مزیدار کبابوں کا ذکر تحریروں اور نجی گفتگو میں اکثر کیا کرتے اور کبھی کبھی دہلی سے واپسی میں وہاں کی مشہور نہاری بھی ساتھ لاتے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم جن کو وہ ان کے شگفتہ اسلوب کی بنا پر البیلا انشا پرداز کہا کرتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کے رہنے سہنے، کھانے پینے کے معمولات پر بڑے دلچسپ انداز میں مضامین لکھا کرتے تھے جن کو وہ عبرت آفرینی اور حقیقت آفرینی کے لحاظ سے بہت پسند کرتے اور ان پر تاثرات اپنے خاص انداز میں بیان کرتے اور کبھی کبھی ان کو صدق میں بھی نقل کرتے۔

اردو کو وہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی گنگا جمنی ثقافت کا اہم جز و لاینفک قرار دیتے تھے اور اس کی ہر خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے محکمہ کے ذریعہ مختلف قسم کے اردو پروگرام ان ہی کی کاوشوں سے نشر ہوا کرتے تھے وہ اس کی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اپریل 1948 میں اس کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے آئے اور ان ہی کی معیت میں ان سطور کے راقم نے بھی پہلی بار دہلی کی زیارت کی۔ یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب دہلی میں مسلمانوں کی آبادی سمٹ کر کچھ خاص علاقوں میں رہ گئی تھی اور اکا دکا مسلمان بھی

گھر سے باہر نکلتے ڈرتا تھا۔ مولانا رفیع احمد قدوائی وزیر حکومت ہند کی قیام گاہ پر تھوڑی دیر ٹھہرے پھر جلسہ میں تشریف لے گئے اور یہ خاکسار ایک پرانے ملازم کے ہمراہ قطب صاحب، حضرت نظام الدین اولیاء کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے بعد جامع مسجد اور لال قلعہ آیا۔ دوپہر کے کھانے پر سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست نے باصرار اپنے مکان کوچہ چیلان میں بلایا تھا اور مولانا کو لینے اسٹیشن اپنے صاحبزادہ کو بھی بھیجا تھا۔ کھانے میں حلال گوشت کا خاص انتظام تھا۔ وہ کچھ دیر تک دہلی کے ہولناک فسادات اور تباہی کا ذکر افسوس اور ہمدردی کے ساتھ کرتے رہے، مجھ سے کہنے لگے "ارے میاں! اب دلّی میں کیا رکھا ہے؟ نہ وہ زبان رہ گئی اور نہ دلّی کے رہنے والے کہ جن کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی"۔ ہم لوگ شام کی ٹرین سے لکھنؤ واپس چلے گئے۔

مولانا کو اصل تعلق اور دلچسپی پرانی دہلی یا شاہجہاں آباد سے تھی جہاں مسلم ثقافت اور اردو کا وجود محسوس ہوتا تھا مگر آہستہ آہستہ ان کے سامنے دونوں کا زوال ہوتا گیا اور اس کی جگہ نئی دہلی کی موجودہ جگمگاتی تہذیب اور زرق برق نے لے لی جس کا اثر انھوں نے شدت سے محسوس کیا۔

مولانا کو 1919 میں نظام حیدر آباد کی طرف سے علمی وظیفہ منظور ہوا تھا جو بعد میں لکھنؤ خزانہ منتقل ہو کر ان کو زندگی بھر ملتا رہا۔ البتہ 1948 کے پولیس ایکشن کے بعد حکومت نظام کے امور خیر سے ملنے والی ہر قسم کی امداد ختم کر دی گئی جس کی زد میں ان کی پنشن بھی آ گئی جس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں وہ دہلی آ کر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے جو نہایت تپاک اور خندہ جبینی سے ملے کیونکہ وہ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کے ملنے والے تھے اور خود نہرو جی بھی بحیثیت صدر کانگریس دورہ پر دریاباد جا چکے تھے اور مولانا کی علمی قدر و منزلت سے واقف تھے، چنانچہ اس مختصر ملاقات میں مولانا نے ان کی خدمت میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا ایک پارہ بھی پیش کیا جس کو انھوں نے احترام و عقیدت سے قبول کیا اور پھر ان کی بحالی پنشن کے لیے ایک زوردار مراسلہ اس وقت کی حکومت حیدر آباد کو بھیجا جس سے ان کی رکی ہوئی پنشن پھر ملنے لگی۔ پنڈت جی کو اس بات سے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عظیم الشان کارنامہ مولانا نے بذات خود تن تنہا انجام دیا ہے۔

آزاد ہند کی حکومت میں مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سید محمود مولانا مرحوم کے مخلص دوست تھے۔ نیز ڈاکٹر تارا چند اور خواجہ غلام السیدین سے بھی گہرے تعلقات تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ان سے جامعہ ملیہ کے سلسلہ میں خصوصی روابط قائم ہو چکے تھے جوان کی مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری، بہار کی گورنری کے بعد نائب صدارت کے دور میں برابر بڑھتے رہے اور دہلی میں انھوں نے اصرار کر کے مولانا کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا۔

حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات کے ماہوار جریدہ 'آج کل' کو بھی مولانا پسند فرماتے تھے، چنانچہ اس میں ان کا ایک مضمون غبار کارواں کے نام سے اپنی سوانح حیات پر شائع ہوا جو اپنی ادبی دلآویزی اور جامعیت کی بنا پر علمی و ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ ادارہ 'آج کل' نے ان سے تصویر بھیجنے کی فرمائش کی جس کا جواب انھوں نے بڑے لطیف انداز میں غالبؔ کے ایک حسب حال شعر سے دیا:

عشق اور مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکونامی فرہاد نہیں

دلّی اور لکھنؤ کی چشمک ادب اور تہذیب و ثقافت کے دائروں میں مشہور ہے اور بعض حضرات اس سلسلہ میں غالیانہ شدت کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے مولانا اس معاملہ سے دلچسپی ضرور رکھتے تھے لیکن اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ۔ وہ شریفانہ اختلافات اور صحت مند مقابلہ و مسابقت کو پسند کرتے تھے لیکن ذاتی حملوں اور لسانی یا علاقائی تعصب وتحزب کے خلاف تھے چنانچہ وہ برابر دہلی کی ٹکسالی زبان، روایتی تہذیب و معاشرت کی تعریف کرتے اور وہاں کے اہل زبان حضرات کے محاورات، تلفظ اور اجتہادات کو مستند اور معتبر مانتے تھے۔ چنانچہ میر امّن، غالب، نذیر احمد، حالی، سر سید، راشد الخیری، ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی، خواجہ محمد شفیع، اشرف صبوحی کی نثر نگاری اور میر، غالب، درد، داغ کی شاعری کے معترف اور مداح تھے۔

خارزار سیاست سے وہ عام طور پر کنارہ کش رہے۔ البتہ مولانا محمد علی مرحوم کی رفاقت میں تحریک خلافت میں چند سال تک شریک رہے اور دہلی میں ہونے والے مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرتے رہے، اودھ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے لیکن متنازع امور میں انھوں نے رواداری اور غیر جانب داری کا رویہ رکھا مثلاً سعودی شریفی تصفیہ یا نہرو رپورٹ اور کونسلوں میں داخلہ وغیرہ جیسے معاملات میں۔ اپنے ہفتہ وار سچ میں انھوں نے زور ہندو مسلم اتحاد، اصلاح معاشرت، رد بدعات، سودیشی مصنوعات کی ہمت افزائی اور ادب صالح کی ترویج پر دیا۔ شروع میں ان کا سیاسی رجحان کانگریس اور جمعیۃ العلماء کی طرف تھا مگر امتداد زمانہ سے اس میں فرق

ہوتا گیا اور سیاست سے الگ ہوتے گئے۔

ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں رہ کر یہاں کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتے رہے اور امن وآشتی کی کوششیں کرتے رہے۔ ان کے بہت سے دہلی کے رفیق پاکستان چلے گئے اور ناموافق حالات کی بنا پر ان سے ملاقات بلکہ مراسلت نہ ہوسکنے پر اپنے رنج وغم کا اظہار اپنی تحریروں میں اکثر کرتے رہے۔

ان کے ہفتہ وار اخبارات سچ، صدق اور صدق جدید کے خریدار اور مخلص دہلی میں خاصی بڑی تعداد میں تھے۔ تقسیم کا منفی اثر ان پرچوں پر بھی پڑا۔ دہلی کے سیاسی اور تہذیبی انقلاب پر وہ اپنے مخلصانہ تاثرات اپنی تحریروں اور نجی گفتگو میں بڑی حسرت اور اثر سے ظاہر کرتے اور دہلی کو مرحوم بڑی للک سے یاد کرتے تھے۔

نئی دہلی کے متعلق ہفتہ وار سچ مورخہ 16 مئی 1927 میں یہ سچی باتیں لکھیں: ''رائے سینا (نئی دہلی) کی سیر کا کبھی تو آپ کو اتفاق ہوا ہے؟ دلہن کی طرح ایک پورا شہر آپ کو آباد ملے گا۔ ہر طرف سبزہ لہلہاتا ہوا، پھول کھلے ہوئے، جگمگاتی ہوئی بجلی کی روشنی، گرمی میں ٹھنڈک پہنچانے والے بجلی کے پنکھے، وسیع ونفیس ٹھنڈی سڑکیں، شاندار عمارتیں، لق ودق دفتر وایوان، سجی سجائی ہوئی کوٹھیاں، صبا رفتار موٹریں، زرق برق وردی کے ساتھ دوڑنے والے چپراسی اور اردلی۔ ہر گوشہ داماں باغباں کا جواب، ہر چپہ کفِ گلفروش کا نمونہ۔ غرض جہاں تک آپ کی نظر کام کرے گی امارت، دولت، عیش وعشرت، تکلف ونفاست کی ایک مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جاچکا جب جا کر سالہا سال سرکار کے اقبال کی یہ پختہ اور سنگین بارگاہ وجود میں آئی ہے۔

اسی بہشت شداد کے پہلو بہ پہلو اسی اسمبلی ہال سے چند قدم کے فاصلے پر کچھ اور انسانی ہستیاں بھی آباد ہیں وہ بھی اسی اللہ کے بندے ہیں، وہ بھی انسانوں ہی کی شکل وصورت رکھتے ہیں، ان کے بھی دماغ، ہاتھ پیر آدمیوں ہی کے سے ہیں محلوں اور قصروں کی سیر سے فرصت ہو تو ایک لمحہ کے لیے ان بدنصیبوں کے بھی مکانات پر نظر کرتے چلیے۔ یہ انسانوں کے مکانات ہیں یا جانوروں کے بند کرنے کے باڑے؟ جانوروں میں بھی ''صاحب'' کے گھوڑوں کے رہنے کے اصطبل اور کتوں کے رہنے کے کمرے تو یقیناً ان سے زائد وسیع وآرام دہ ہوتے ہیں۔ ''کلبہ احزان'' فارسی میں بارہا آپ نے پڑھا ہوگا، نمونہ دیکھنا ہو تو ان مزدوروں اور قلیوں کے گھروں کا

مشاہدہ کیجیے۔ پلاسٹر اور چونے کا ذکر نہیں ایسی بھی کوٹھریاں ہیں جن کی دیواروں کو مٹی کا معمولی گارا تک نصیب نہیں ہوا محض اینٹیں اوپر تلے رکھ کر اس کا نام دیوار رکھ دیا گیا۔ انھی باڑوں میں ان بدنصیبوں کو مع اپنے بیوی بچوں کے، سارے خاندان اور ساری خانگی ضرورتوں کے ساتھ ہر موسم کی سختیاں کاٹنی پڑتی ہیں اور یہ ہیں کون لوگ؟ وہ جنھوں نے اپنا پسینہ بہا بہا کر ان عمارتوں اور کوٹھیوں کی تعمیر کی ہے وہ جنھوں نے اپنے خون جگر سے یہاں کے پارکوں اور چمنوں کی آبیاری کی ہے۔

نئی دہلی کا ذکر محض بطور مثال کر دیا گیا ورنہ کلکتہ، بمبئی، مدراس، لاہور، لکھنؤ جہاں کہیں بھی جدید تمدن کے مبارک قدم پہنچ چکے ہیں، جہاں کہیں بھی سڑکیں وسیع کی جارہی ہیں سر بہ فلک کوٹھیاں تعمیر ہو رہی ہیں، نئے نئے کونسل چیمبر، ہوٹل، ہائی کورٹ، اسٹیشن تیار کیے جارہے ہیں، پارک لگائے جارہے ہیں، سینما تھیٹر اور رقص کے لیے عالیشان عمارتیں کھڑی ہوتی جارہی ہیں، کالجوں اور درسگاہوں کے نام سے قصر اور محل وجود میں لائے جارہے ہیں، وہاں بعینہٖ یہی کیفیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں؟ کیا جس تمدن جدید کی برکتوں کا اس قدر غلغلہ بلند ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ غریبوں کو روز بروز غریب تر بنایا جائے اور خوشحال طبقہ کے عقل و دماغ کو اس درجہ مسخ کر دے کہ اس کی آنکھیں نہ کسی کے بہنے والے آنسوؤں کو دیکھ سکیں اور نہ اس کے کان کسی دکھیارے کی فریاد کو سن سکیں''؟

بعد کے سفر ناموں میں اس قسم کے تاثرات اور نمایاں نظر آتے ہیں:

دہلی کے جن اداروں اور جماعتوں سے ان کو خاص تعلق اور انسیت تھی ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، انجمن ترقی اردو، مرکز تبلیغ، درگاہ نظام الدین اولیاء، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، طبیہ کالج، ہمدرد دواخانہ اور اس کے متعلقہ ادارے اور جامع مسجد دہلی، لال قلعہ اور دیگر تاریخی عمارتیں شامل تھیں۔

مولانا مرحوم کے پاس گاندھی جی کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اردو کا خط موجود تھا، نیز پنڈت موتی لال نہرو کے بھی دو اردو کے خط۔ اس کی اطلاع پا کر تین مورتی ہاؤس کے نہرو میوزیم کے مرکز کے ذمہ دار مولانا سے ملنے آئے اور باصرار ان قیمتی خطوط کو اپنے ساتھ لے گئے تاکہ ان کو بطور قومی یادگار محفوظ رکھا جائے۔

دلّی کے مشہور ادیب اور انشا پرداز خواجہ حسن نظامی مرحوم سے ایک زمانہ میں مولانا کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور وہ اکثر ان کے ہاں مہمان رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے روزنامچہ میں کئی جگہ ان کا ذکر اپنے رسالہ منادی میں کیا ہے اور ان کو فلسفی شاہ کا لقب بھی دیا۔ افسوس ہے کہ 27-1926 میں ان سے اور مولانا محمد علی جوہر سے شدید مخالفت کی بنا پر ایک قلمی جنگ چھڑ گئی جس میں ذاتی حملوں اور سب وشتم کی بہتات تھی۔ مولانا مرحوم نے اس زمانہ میں فریقین میں مصالحت کی کوشش کی اور خواجہ حسن نظامی صاحب سے خاص طور سے درخواست کی کہ وہ ذاتی حملوں اور رکیک الزام تراشی سے پرہیز کریں اور اصولی معاملات پر اختلاف رکھیں، کیوں کہ اخلاقی واجتماعی اعتبار سے یہ رویہ غلط اور قابل اعتراض ہے۔ افسوس ہے کہ ان کوششوں میں کامیابی نہ ہو سکی اور فریقین میں صفائی نہ ہو سکی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کا شروع سے گہرا تعلق رہا کیونکہ یہ ادارہ ان کے محبوب مولانا محمد علی جوہر نے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور متعدد مخلص شخصیتوں کے اشتراک سے ملک کی قومی وملی یونیورسٹی کے طور پر قائم کیا گیا تھا جس کو گاندھی جی کی سرپرستی وتعاون حاصل تھا۔ مولانا محمد علی انھیں فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے بلانا چاہتے تھے مگر ان کے الحاد کی وجہ سے اس تجویز پر عمل نہ کر سکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے شیخ الجامعہ ہونے کے بعد ان کے جامعہ سے اور تعلقات بڑھے اور اس کے استادوں میں شفیق الرحمٰن قدوائی، سعید انصاری صاحب وغیرہ ان کے معتقد ومعتمد تھے۔ چنانچہ اس کے سلسلہ میں تحریری اور زبانی مشورہ دیتے رہے۔ ایک دفعہ ذاکر حسین صاحب دریاباد بھی تشریف لے گئے۔ انھوں نے کبھی کبھی اس ادارہ خصوصاً اس کے رسالہ جامعہ کے مضامین پر تنقید واحتساب بھی کیا جس کو ذاکر حسین صاحب اور ارباب جامعہ نے خوش دلی سے قبول کیا۔ دلّی کے سفرناموں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

انجمن ترقی اردو سے ان کا تعلق مولوی عبدالحق صاحب کے زمانہ سے رہا اور ان کی فرمائش پر مولانا نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے۔ انجمن کے ہفتہ وار 'ہماری زبان' میں ان کے مضمون و مراسلے چھپتے۔ وہ خود انجمن کی اردو کے لیے تعمیری خدمات خصوصاً لغت وزبان کے معاملات میں بڑے معترف تھے۔ تقسیم ملک کے کچھ عرصہ بعد مولوی عبدالحق صاحب نے پاکستان جانے سے قبل انجمن کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری اپنے جن معتمد رفیقوں کو سونپی تھی ان میں ایک نام مولانا کا بھی تھا۔ انجمن کی کارگزاریوں اور اس کی کتابوں کا ذکر تعریف سے اپنے ہفتہ وار

اخبارات میں کرتے رہتے اور اسے مناسب مشورہ دیتے رہتے۔

انھیں دلی کے مؤقر و معتبر ادارہ ہمدرد دواخانہ اور اس کے متعلقہ اداروں سے خاص انسیت اور لگاؤ تھا اور اس کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کے اخلاص، جوش عمل اور قومی وملی خدمات کا ذکر بڑی خوشی اور فراخ دلی سے کرتے۔ خود حکیم صاحب مرحوم کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کی خدمت میں شربت روح افزا اور دیگر دوائیں بھیجا کرتے، جب وہ دہلی آتے تو ان کی دعوت کا اہتمام کرتے اور اپنے اداروں میں لے جاتے۔ مولانا طب یونانی کے لیے ان کی کوششوں ان کے علمی ذوق اور خدمت خلق کے جذبات کے بڑے قائل تھے اور ان کا نام بطور مثال پیش کیا کرتے۔

غرض دہلی سے مولانا کا گہرا تعلق مختلف دائروں سے تھا اور وہ اسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور اردو کا سب سے بڑا مرکز سمجھتے تھے۔

◆◆◆

باب دوم

مشاہیر دہلی

(علما، شعرا، ادیبوں اور سیاسی شخصیتوں کے خاکے اور ان سے متعلق نثریے)

مولانا کو دلی کی متعدد شخصیتوں جن میں علماء، نثر نگار، شعراء، صحافی اور سیاست داں شامل تھے، سے گہری انسیت اور عقیدت تھی جس کا اظہار وہ تحریروں اور نجی گفتگو میں برابر کیا کرتے تھے۔ اس کی نوعیت بھی امتداد زمانہ کے اثر سے بدلتی رہی۔ ان میں متقدمین اور معاصرین دونوں شامل تھے۔ اس طویل فہرست میں سے کچھ نام بطور مثال یہاں دیے جا رہے ہیں: حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، امیر خسرو، شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان، میر، درد، غالب، حالی، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولوی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری، ملا واحدی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، خواجہ حسن نظامی، مولانا شوکت علی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، سید ہاشمی، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین، بابائے اردو مولوی عبدالحق، شفیق الرحمٰن قدوائی، سعید انصاری، پنڈت برج موہن، دتاتریہ کیفی، منشی گوپی ناتھ امن بشیشور پرشاد منور، گلزار دہلوی، لالہ سری رام، لالہ شام ناتھ، جگن ناتھ آزاد، دیوان سنگھ مفتون، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، آل عبا آوارہ، مالک رام، ڈاکٹر

تاراچند، مولانا عثمان فارقلیط، حاجی محمد شفیع پیکارڈ واچ والے، رازق الخیری، گوپال متل، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شیو پرشاد سنہا، محمود سعید بلالی، ساغر نظامی وغیرہ۔

ان میں سے کچھ پر انھوں نے خاکے لکھے ہیں او کچھ لوگوں کو ریڈیو نشریوں میں یاد کیا ہے۔ ان نگارشات کو یہاں یکجا کر کے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے کیونکہ اس سے قبل یہ اخبارات یا کتابوں میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں جس میں سے اکثر نایاب ہیں۔ مولانا نے جو خاکے اور تاثرات لکھے ہیں وہ حقیقت نگاری کے ساتھ ادبی شگفتہ نگاری اور جامعیت کے لحاظ سے دل آویز اور دلکش ہیں۔

گاندھی جی، جواہر لال، رفیع احمد قدوائی وغیرہ کا ذکر ان کی خدمات جلیلہ اور دہلی سے گہرے تعلق کی بنا پر کیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا کے گہرے تعلقات عرصہ دراز سے تھے جو آخر دم تک قائم رہے۔ افسوس ہے کہ کچھ حلقوں اور حضرات نے اس بے بنیاد مفروضہ کو شہرت دی کہ مولانا ان کے مخالف و معاند تھے، اس کی حقیقت صرف یہ تھی کہ ایک ادبی مسئلہ پر دونوں بزرگوں میں 14-1913 میں اختلاف رائے اور تلخی پیدا ہوگئی تھی جو چند سال بعد دور ہوگئی اور دونوں کے تعلقات شگفتہ ہوگئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مولانا سے خاص عقیدت رکھتے تھے وہ پٹنہ اور دہلی میں ان کے مہمان بھی رہے۔ ذاکر صاحب کے خطوط بنام مولانا دریابادی سے دونوں کے تعلقات کا پتہ چل سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے خلوص اور جوش عمل کے مولانا بڑے قائل تھے اور ان کو مجاہد ملت قرار دیتے تھے چنانچہ سیاست سے الگ رہنے کے باوجود لوک سبھا میں ان کی فتح پر مبارکباد کا کارڈ بھیجا جس پر صرف '' اَلَمْ تَرَ کَیْفَ '' لکھا ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کے مخالف کا انتخابی نشان ہاتھی تھا۔

ان کے علاوہ انھوں نے بہت سے دلّی والوں کو خطوط اور پیام بھیجے جس سے مختلف قسم کی معلومات اور لکھنے والے کے خلوص اور دلی جذبات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

دلّی کے شعراء میں مولانا کو امیر خسرو، میر اور غالب سے خصوصی دلچسپی اور تعلق تھا۔ امیر خسرو کے بارے میں انھوں نے دو تقریریں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی تھیں ایک ان کی شخصیت اور حضرت نظام الدین اولیاء سے تعلق کے بارے میں اور دوسری میں ان کی مشہور غزل :- دلم در عاشقی آوارہ شد- آوارہ تر بادا کی تشریح نہایت جامع اور شگفتہ انداز میں کی۔

میر تقی میر کے بارے میں مولانا نے ایک نشریہ میں بڑی خوبی سے ان کا تعارف یوں کرایا:

"..... یہ میر صاحب تھے کہاں کے؟ کس خاک سے اٹھے، کس خاک میں ملے؟ آنکھ اکبر آباد کی سرزمین پر کھولی یہیں پلے بڑھے کھیلے کودے، قدم جوانی کی دہلیز پر رکھا ہی تھا کہ دلّی کی کشش نے زور دکھایا آئے اور جیسے یہیں کے ہوگئے۔ جوانی کی چڑھی ہوئی کمان ابھی اتری ہی تھی کہ آصف الدولہ کی قدر دانیاں پیشوائی کے لیے آگے بڑھیں اور لکھنؤ کھینچ لائیں اور سعادت علی خاں کے زمانے میں یہیں تربت کو آباد کیا"۔

ایک اچھا اور سچا انشا پرداز ہی اس طرح کسی شخص کو زندہ اسلوب میں چلتے پھرتے بولتے چالتے اور ہماہمی کرتے دکھا سکتا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے اردو میگزین کے "میر" نمبر کے لیے جناب نثار احمد فاروقی صاحب لائبریرین دہلی یونیورسٹی کو مولانا نے یہ پیام 1962 میں بھیجا:

"میگزین کا میر نمبر آں عزیز کی رہبری میں نکلے گا انشاء اللہ سب میگزینوں کا "میر" ہوگا۔ مضامین حقیقی ہوں گے لیکن خشک نہیں۔ عمیق ہوں گے لیکن دقیق نہیں، رطب وشگفتہ ہوں گے لیکن سپاٹ و بے معنی نہیں، ندرت رکھیں گے لیکن غرابت نہیں۔ یہ سب باتیں بہ طور ایمان بالغیب پہلے ہی فرض کیے ہوئے ہوں اور خدانخواستہ یہ سب نہ سہی جب بھی یہ جرأت کیا کچھ کم قابل داد اور مستحق آفرین ہے کہ میر تقی میر جیسے پرانے شاعر کی یاد آپ اس دور جدت پرستی میں منانے نکلے ہیں"۔ ایسے باکمال کی یاد منانی خود اپنے ذوق کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

اردو شاعروں میں مولانا سب سے زیادہ گرویدہ اور معتقد غالب کے تھے، نہ صرف ان کی شاعری کے بلکہ ان کی نثر اور خاص طور پر ان کے خطوط کے۔ چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میگزین کے غالب نمبر کے لیے انھوں نے اس کے ایڈیٹر پروفیسر مختار الدین آرزو کو ایک پیام بھیجا:

"آپ کے ذوق ادب کا قائل تو میں میگزین کا پہلا نمبر پڑھ کر ہی ہو چکا تھا، آپ کی جرأت کا قائل ہونا پڑ رہا ہے کہ آپ اس ترقی اور ترقی پسندی کے دور میں غالب مرحوم کا نام زندہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں:

که اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مجھ بے بحر تنگ نظر کے علم میں تو اردو میں جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے کوئی شاعر اس پایہ کا نہ غالب سے قبل پیدا ہوا تھا اور نہ آج تک ہوا ہے اور یہ کم سواد حضرت غالب کی شاعری ہی کی طرح ان کی اردو نثر کا بھی دلدادہ اور قتیل ہے"۔

غالب کے فلسفہ پر ان کا نثریہ ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے کردار اور شخصی عظمت کا ذکر صدق میں جا بجا ملتا ہے۔

غالب کے ایک فرنگی شاگرد الگزینڈر ہیڈلی آزاد (فرانسیسی) 1829-1861 کے متعلق مولانا نے رسالہ معارف اعظم گڑھ میں ایک مضمون جنوری 1922 میں لکھا جس میں انھوں نے بیان کیا کہ انھیں اٹھارہ سال کی عمر سے اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مشورۂ سخن کے لیے کلام نواب زین العابدین خاں عارف شاگرد عزیز مرزا غالب اور پھر خود غالب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ ان حضرات کا فیض توجہ کہیے یا خود آزاد کی طباعی کہ کچھ ہی روز میں اچھی خاصی مشق کر لی اور کلام میں وہ پختگی آگئی جو ایک غیر قوم کے فرد کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ تخلص آزاد کرتے تھے، دیوان آزاد کی ضخامت 170 صفحات کی اور مطبع احمدی آگرہ سے 1863 میں شائع ہوا ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

دیوان میں توحید حمد باری، نعت مسیح، غزلیات، اپنے استاد عارف کا طویل مرثیہ موجود ہے۔ غزلیں اکثر غالب کی زمینوں میں کہی ہیں اور کچھ غزلوں کی تضمین بھی۔ صفائی، بیان سلاست اور شستگی پائی جاتی ہے، ترکیبوں اور الفاظ میں کچھ غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں جو غیر قوم کے فرد کے لیے قابل معافی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی

غالب کے ایک عزیز اور مخلص شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی تھے جنھوں نے اپنے استاد کا لاثانی مرثیہ کہا اور پھر ان کی مستند سوانح عمری لکھی۔ مولانا ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں کی برابر تعریف کرتے تھے اور ان کا شمار اردو کے ادبِ عالیہ میں کرتے تھے۔ مسدس حالی کے ایک ایڈیشن پر انھوں نے ایک دلنشین دیباچہ بھی لکھا۔ ایک دلچسپ اور مفصل مضمون "اردو کا واعظ

شاعر'' کے عنوان سے لکھا جس کے آغاز کا اقتباس پیش ہے:

'' آج سے کوئی پچیس سال ادھر کی بات ہے۔ الہلال افق کلکتہ سے نیا نیا طلوع ہوا تھا اور ملک کی ساری فضا ابوالکلامی ادب و انشاء کے غلغلہ سے گونج رہی تھی کہ ایک روز اس کے کسی مقالہ میں یہ شعر نظر سے گزرا:

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہوگئی۔ لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا۔ درج صرف شعر تھا، شاعر کا نام نہ تھا۔ دل نے کہا اور اس کہنے میں کوئی تامل یا تذبذب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر غالب کا ہے۔ دیوان غالب میں پڑھنا اگر یاد نہیں پڑتا نہ سہی، دیوان مطبوعہ میں اگر موجود نہ ہو تو کیا، رہ گیا ہوگا، لیکن ہے یقیناً غالب کا۔ اس مسلّم استاد کے سوا کون ایسا شعر کہہ سکتا ہے۔ غالب کا اتنا پختہ رنگ بجز خود غالب کے اور کہیں مل ہی کہاں سکتا ہے؟ اسی درمیان میں حاضری ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی، ذکر اس شعر کا آیا، ارشاد ہوا کہ غالب کا نہیں حالی کا ہے۔ ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا! کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر؟ وہ بے چارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے اشعار کے ناظم، انھیں غزل کے کسی پھڑ کتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور استادانہ تخیل میں رعنائی، طرز ادا میں زیبائی۔ غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہوکر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں۔ لیکن حقیقت بہر حال حقیقت رہتی ہے۔ دیوان حالی اٹھا کر دیکھا، شعر اپنی جگہ موجود''۔

اس کے بعد دیوان حالی سے متعدد اشعار نازک خیالی، ذہانت، شوخی، حلاوت، معاملہ بندی کی نزاکتوں سے معمور پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غزل گوئی میں حالی کسی سے ہیٹے نہیں۔ پھر مسدس، دہلی کے مرثیہ، بیوہ کی مناجات کی کھل کر داد دی ہے۔

دہلی کے دور آخر کے ایک مشاعرہ میں حالی نے تذکرہ دہلی مرحوم کے نام سے ایک مؤثر نظم، جس سے بزم سخن بزم ماتم میں تبدیل ہوگئی تھی، پر مولانا نے یہ مؤثر تبصرہ کیا ہے: '' آج اگر ہمارے آپ کے آنسو نہیں ٹپک پڑتے تو ہمیں دہلی مرحوم ہونے کا احساس ہی کب ہے؟

آنکھوں میں تو اب نئی دہلی بسی ہوئی ہے، شاہجہاں آباد کو جانتا کون ہے؟ اسمبلی ہال کے سامنے لال قلعہ کو جھانکنے بھی کون جاتا ہے''۔

مولوی نذیر احمد دہلوی

دلّی اردو نظم ونثر دونوں کا بڑا قدیم اور اہم مرکز ہے۔ یہاں کی ٹکسالی زبان ہر طرح سے مستند ومعتبر ہے چنانچہ یہاں کے کئی نثر نگاروں سے مولانا خاصے متاثر ہوئے جن میں اولیت مولوی نذیر احمد صاحب کو حاصل تھی۔

مولانا دہلی کے اس مشہور ادیب اور اردو کے پہلے ناول نگار مولوی نذیر احمد صاحب کے علم و فضل اور ٹکسالی زبان کے بڑے معترف ومداح تھے۔ چنانچہ ان کی مشہور تصنیف 'توبۃ النصوح' پر ایک نشریہ میں ان پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس کے آخر میں ان کی داد میں یہ دلچسپ فقرہ بھی تھا'' نذیر احمد زبان دان تو خیر تھے ہی ساتھ ہی زبان آور بھی تھے''۔

اپنے ایک مضمون 'نثر نگاروں کی شاعری' میں مولوی صاحب کو داد وتحسین بڑے انوکھے اور شگفتہ انداز میں یوں دی ہے:

> ''یہ بے تخلص کے شاعر بھی عجب ستم ظریف تھے۔ غزل والی شاعری پر لعنت بھی بھیجتے جاتے لیکن اپنا معمول کوئی بیس سال تک یہ رکھا کہ سالانہ جلسہ علی گڑھ کا ہو تو انجمن حمایت اسلام لاہور کا ہو یا انجمن طبّیہ کا ہو تو حاضرین کے اصرار پر اپنی نظم بھرے جلسہ میں ضرور پڑھ کر سناتے اور سننے والے ان کے کلام پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔ نظموں میں لفظ بڑے پُر شکوہ، ثقیل، مغلق ترکیبیں، مولویانہ اور عربیت سے گرانبار۔ مضمون پند وموعظت کے پشتارے۔ اس پر بھی کلام میں دلآویزی غزل والی اور خشکی کی جگہ شگفتگی ابلتی ہوئی ایک نظم کی بسم اللہ آپ بھی سنیں:

نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلاف دین و مذہب کو

اور پھر یہ شعر ہوا ہے:

ہے آہوئے رم خوردہ پر رانڈ گویا
یہ چھوٹا ہوا ہے ان میں سانڈ گویا

راوی کا بیان ہے کہ مولانا جب دوسرے مصرعہ پر پہنچے تو 'چھوٹے ہوئے سانڈ' کو اسٹیج پر ایکٹ کرنا چاہا، جلسہ میں کھلبلی مچ گئی اور صدر جلسہ کو مولانا کی خوش ذوقی پر بریک لگانا پڑا۔ [یہ مضمون رسالہ نقوش لاہور میں 1957 میں شائع ہوا تھا۔]

مولانا کے تحریر کردہ دلی سے تعلق رکھنے والے 16 مشاہیر کے خاکے، نشریے اور تاثرات یہاں پیش کیے جارہے ہیں:

امیر خسرو — بزرگ اور درویش کی حیثیت سے

[یہ نشریہ مولانا مرحوم نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے 18 نومبر 1980 کی شام کو مشہور شاعر بزرگ اور درویش امیر خسروؒ پر نشر کیا اور دس منٹ کی مختصر تقریر میں خسروؒ کی شاعری سوز دل اور بزرگی پر جچے تلے اور معتدل انداز میں تبصرہ کیا۔ روزمرّہ کی لطافت اور زبان کی دلآویزی خاص طور پر قابل ذکر ہے]

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے! کتاب کی کتاب ازبر تھی۔ زیادہ نہیں پشت در پشت ادھر کی بات ہے کہ کتاب تھی مکتبوں میں چلی ہوئی، گھروں میں پھیلی ہوئی، زبانوں میں چڑھی ہوئی، گویا اپنے زمانہ تصنیف سے صدیوں بعد تک مقبول و زندہ، مشہور و تابندہ! — دست قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھ دی تھی، جس کے کلام کو حسن قبول کی دولت دے دی تھی۔ اسی کا نام تھا امیر خسرو۔ امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر و ادب اس کی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبہ سے آگاہ۔ سر مشاعرہ آجائے تو میر محفل اسے پایئے۔ خاندان چشت اہل بہشت کے کوچہ میں آنکلئے تو حلقہ ذکر و فکر میں سر مسند جلوہ اس کا دیکھیے۔ اچھے اچھے شیخ دم اس کا بھر رہے ہیں۔ معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں۔

والدین نے نام ابوالحسن رکھا۔ شہرت عام کے نقیبوں نے امیر خسرو کہہ کر پکارا۔ سال ولادت ہجری کا چھ سو اکیاون (651) اور عیسوی کا بارہ سو ترپن (1253)، ترکستان کے علاقہ (اب قلمرو افغانستان) بلخ میں کوئی بستی ہزارہ کہلاتی ہے، یہ گوہر اسی کان سے نکلا۔ ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے نام سے موسوم تھا یہ جوہر اسی خاندان سے چمکا۔ والد بزرگوار کا نام تھا امیر شمس الدین محمود شمسی۔ چنگیز خاں کے زمانہ میں ترک وطن کر ہندوستان پہنچے۔ یہاں ایک مقام پٹیالی عرف

مومن آباد تھا وہاں آبسے۔ پرانے تذکرہ نویسوں نے دھندلی سی نشاندہی کی ہے کہ کہیں نواح سنبھل یا مضافات دہلی میں تھا۔ نئے جغرافیہ نے نقشہ پر انگلی رکھ کر دکھا دیا کہ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے۔ شادی یہیں ہوئی، بستی کے نامور اور درویش منش رئیس اور ضلع کے منصب دار نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ، یہیں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔

تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں کوئی مجذوب رہتے تھے صاحب کشف۔ یہ لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو ان کی خدمت میں لائے۔ دیکھتے ہی بولے یہ کس کو لے کر آئے۔ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا۔ مجذوب صاحب کی نگاہ کشفی شاعری کی حد تک رہی۔ بچہ نے بڑے ہو کر فقر و درویشی میں وہ مقام حاصل کیا کہ شاعری منھ دیکھتی رہ گئی۔

تعلق عمر بھر کہنا چاہیے کہ سرکار و دربار سے رہا۔ کبھی براہ راست شاہی دربار سے اور کبھی امرائے نامدار سے۔ اور سرکاریں بھی ایک دو نہیں خلجی اور تغلق ملا کر سات سات بادشاہوں کی دیکھ ڈالیں۔ پھر شخصی سلطنتوں کی نیرنگیاں، انقلاب کے طوفان قیامت خیز دیس میں بھی رہے پردیس بھی گئے۔ بنگال بھی گھومے، اودھ کی بھی سیر کی لیکن دل جہاں اٹکا تھا وہیں اٹکا رہا۔ نظر جس رخ پر ایک بار پڑی تھی اسی پر جمی رہی۔ ابھی آٹھ ہی برس کے تھے کہ عقیدت مند باپ نے لا کر سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ کے قدموں پر ڈال دیا۔ سن رشد کو پہنچے تو بیعت کی تجدید کی، بیعت رسمی نہ تھی، ایک نسبت عشقی تھی کہ دونوں طرف سے قائم ہو گئی تھی۔ خواجہ کا مرتبہ دیارِ محبت و معرفت میں اس سے ظاہر ہے کہ اولیاء کرام نے مقبولین انام نے بقائے دوام کے دربار میں محبوب الٰہی کہہ کر پکارا۔ امیر کو دولت ملی محبت کی بھی، محبوبیت کی بھی۔ تذکرہ نویسوں کی روایت ہے کہ جس روز تجدید بیعت کی ہے سارا ساز و سامان کھڑے کھڑے لٹا دیا، جو نقد دل نثار کر چکا ہو اس کو زر و مال لٹا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے؟

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے بہت پہلے کوئی چھ سات سو برس پہلے باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر ایک سرا میں آکر اترے۔ کنیزیں، خدام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب سب کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر مفلس و مفلوک الحال دہلی سے واپس ہوتے ہوئے اسی سرا میں ٹھہرا۔ رئیس کو بوئے انس محسوس ہوئی بڑھ کر پوچھا کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے۔ پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سن کر تیز ہوا۔ پوچھا اس شہر میں ایک درویش خواجہ

نظام الدین ہیں وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا؟ مفلس بولا'' اتفاق کیسا انہی کے پاس تو گیا تھا، حاجت مند ہوں چاہتا تھا کہ کچھ مل جائے۔ میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں وہی میرے حوالے کردیں انہی کو لیے چلا آرہا ہوں''۔ سننے والا اب شوق و اشتیاق سے بے خود تھا بولا'' خدا کے لیے وہ جوتیاں میرے حوالے کردو اور یہ میرا ساز و سامان سب تمھاری نذر ہے''۔ سائل دنگ و حیران کہ جوتیوں کے عوض یہ لاکھوں کی دولت؟ رئیس صاحب کہیں مجھ بے نوا سے دل لگی تو نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب اور ہنسی دل لگی کی سکت ہی ان میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار پانچ لاکھ روپیہ میں پڑا اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اتری جوتیاں آنکھوں سے لگا کر سر پر رکھ پگڑی کے اندر لپیٹ لیں اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے۔ جوتیاں جس محبوب کی تھیں وہ تو وہی ہیں جنھیں زبان خلق محبوب الٰہی کے نام سے پکارتی ہے اور امیر وہی امیر خسرو تھے جن کا یہ فارسی شعر اس وقت سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کو، حال وقال کی محفلوں کو گرما چکا ہے:

متاع وصل جاناں بس گراں است
گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے

یہ رقم تو خیر لاکھوں ہی کی تھی۔ کہنے والا تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقد جاں کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی یہ سودا نہایت ارزاں ہے۔

آگے چلیے، دنیا کی عمر چند سال اور کھسکی خلجی و تغلق کی بہار رخصت ہوئی۔ دہلی کے تخت پر اب آل تیمور کا اقبال چمک رہا ہے۔ سخن سنج و سخن گستر بادشاہ کے حضور میں محفل سماع گرم ہے۔ جب مطرب اس شعر پر پہنچا:

تو شبانہ می نمائی بہ مبر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

بادشاہ کا ذہن فطرتاً شعر کے ظاہری مفہوم کی طرف گیا قریب تھا کہ شاعر کی بے حیائی کا خمیازہ قوال غریب کو عتاب سلطانی کی شکل میں اٹھانا پڑے کہ ایک مزاج داں و ادب شناس ندیم نے جھٹ ہاتھ باندھ عرض کی کہ'' پیر و مرشد غزل خسرو کی ہے تصویر کھینچ رہے ہیں اپنے تہجد گزار، شب بیدار محبوب، محبوب الٰہی کی کہ ساری رات کن کن اذکار، کن کن اشغال میں گزاری، کون کون سے احوال و مقامات طے کیے کہ جاگنے کا اثر اس وقت تک دن میں باقی ہے''۔ معاً عتاب لطف

میں اور نا گواری واہ میں تبدیل ہو کر رہی۔

وقت کی محدود گنجائش کے ماتحت صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش کر دیا گیا ورنہ غزلوں کی غزلیں نہیں دیوان کے دیوان لبریز ہیں ان ہی مواجیہ واحوال کی تلمیح سے رموز واسرار عارفین کی توضیح سے۔ ہندی کے دوہے اور ٹھمریاں ایک دو کی تعداد میں نہیں پچاسوں اور سیکڑوں سب میں یہی نقشہ جما ہوا ہے۔ یہی رنگ بھرا ہوا۔ حد یہ ہے کہ مرشد خود فرمایا کرتے تھے کہ خدا قیامت میں پوچھے گا کیا لائے ہو؟ جواب میں عرض کروں گا کہ خسروؒ کو۔ گریہ و مناجات میں ہوتے تو عرض کرتے کہ الٰہی میری مغفرت اسی ترک کے سوز دل کے طفیل کر دے۔ بڑوں کا اور مرشد کا وسیلہ پکڑتے ہوئے سب نے دیکھا ہے، چھوٹوں کے اور مریدوں کے وسیلہ بننے کی مثال حضرت امیر خسروؒ کے نصیب میں آئی۔

سوز دل اور ذوق عبادت کا یہ عالم تھا کہ پچھلی رات نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو سات سات پارے قرآن مجید کے پڑھ جاتے۔ جب تک دل ایسا ہی درد وخشیت سے چور چور نہ ہو، اتنا بڑا مجاہدہ کس کے بس کی بات ہے؟ اودھ میں ایک بڑے رئیس کے دربار میں تھے، ماں نے دلّی میں یاد کیا۔ معقول مشاہرہ پر لات مار ماں کے پاس پہنچے۔ ماں کی وفات پر پُر درد مرثیہ لکھا۔ بہ قول مولانا شبلی اڑتالیس سال کی عمر میں ماں کی یاد میں آنسو اس طرح بہاتے ہیں کہ گویا کوئی کمسن بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب پرتو ہے اسی سوز و گداز کا جس کا واسطہ دلا دلا کر خود مرشد علیہ الرحمہ اپنی نجات کے طالب رہتے تھے۔

725 ہجری کا ماہ ربیع الثانی تھا کہ حضرت محبوب الٰہی جنت کو سدھارے۔ امیر اس وقت بنگالہ میں تھے۔ خبر وحشت سنی تو بھاگا بھاگ دہلی پہنچے۔ مزار پر حاضر ہوئے تو اہل ارادت کی روایت ہے کہ ہندی کا یہ شعر اسی وقت پڑھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

ماتمی لباس پہن لیا، سب کچھ لٹا دیا، خالی ہاتھ ہو بیٹھے، غم کی آگ میں جلتے ہجر کی بھٹی میں تپتے خود اپنے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر چھ مہینے کی مدت پوری ہوئی کہ ادھر 18 شوال 725 ہجری مطابق 1325 عیسوی کو خود بھی اپنے محبوب سے جا ملے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی مرشد کائنات کا غم اس سے زیادہ برداشت کر سکی تھیں۔ تجویز پیش ہوئی کہ دفن مرشد ہی کی تربت

میں کیے جائیں۔ احترام شریعت غالب آیا۔ پائینتی کی جانب چند گز ہٹ کر قبر بنی۔ اہل دل اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ آستانہ سلطان المشائخ سے پہلے اگر اس کشتہ عشق ومحبت اور مجسمہ سوز و گداز کے مرقد پر فاتحہ خوانی کر لی جائے تو دل کی انگیٹھی کی چنگاریاں اور تیز و روشن ہو جاتی ہیں۔

غالب کا فلسفہ

(یہ تقریر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے 16 فروری 1942 کو نشر ہوئی۔ اس نشریہ میں مولانا مرحوم نے اردو کے نامور شاعر کی شاعری کا خلاصہ اور اس پر بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز تبصرہ جچے تلے انداز میں کیا ہے۔ اشعار کا انتخاب اور ان کی تشریح خاص طور پر معیاری اور علم و ادب کے قدردانوں کے لیے بڑے کام کی ہے۔ اردو کے اس بہترین غزل گو کو جس انداز میں مرحوم نے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔)

فلسفہ کے نام سے گھبرایئے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے نا مانوس لغات، ثقیل و مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خود شناسی کا، زینہ ہے خدا شناسی کا۔ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ عادات و اطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ ہمارے گردو پیش کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں جن سے ہم کو آپ کو سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی جان کر اور کبھی انجان۔ ان ہی کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو گئے۔ پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں۔ ایک خوش باش زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں عمق کی چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں۔ مغز تک پہنچ جانے کی خوگر سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں کبھی دلآویز نظم میں کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہوگئی ورنہ تحقیق کے راوی کا تو یہ بیان ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے۔ نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا، جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا، مرجھائے دلوں کو کھلا دیا فطرت بشری کے رازدار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معنویت کو بول لطافت و ظرافت کے سروں میں الاپتے۔ ابھی آہ

کا رنگ جما دیا ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہ تھی ان کی حکمت ۔ یہی ان کا فلسفہ۔ یہی ان کی شاعری کا پیام، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے اور دماغ بیدار۔ شعر کم سنی ہی سے کہنے لگے تھے جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا پختگی آتی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقتی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ رندی و سرمستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں لیکن اس بے ہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں:

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ
رفتار نفس بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت و تاثیر دعا، ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا نیا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا اطباق سا چاند ہوتا ہے وہ آخر پیدا ہوتا ہے اس منحنی کم رو اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے، گویا کمال کی بنیاد ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے۔

بدر ہے آئینہ طاق ہلال
غافلاں! نقصان سے پیدا ہے کمال

مذہب کے تشدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے اور فریقانہ غلو سے تنگ آ کر کہتے ہیں کہ سکون خاطر منظور ہے تو بس توحید سے لو لگا لیجیے، وحدت کی خانقاہ میں کنج نشیں ہو جائیے اور یک دان، یک بین، یک گو بن کر رہ جائیے:

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ صنعت و ربوبیت کی کنگھی دست قدرت میں لیے مانگ چوٹی ان کی بھی

درست کیے ہوئے۔ اس مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے:

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدرو قیمت سب جانتے ہیں یہ فطرت بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے۔ لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں اور باہر اس وقت نکالتے ہیں جب چوٹ پڑ لیتی ہے دل پر نہ سہی کم از کم جسم پر سہی سلسلہ موجودات میں جس کا جیسا ظرف ویسا ہی اس کا مرتبہ:

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بے شک بے حد و بے شمار، لیکن فطرت میں جو قدرت عصیاں طاقت گناہ رکھ دی گئی ہے وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گناہ کہاں تک کرے گا، جتنے بھی کرے گا پھر بھی بہت سے چھوٹ جائیں گے۔ کرسکتا ہوگا مگر کرے گا نہیں۔ پھر کیا وقت جب جزائے کامل کا آئے گا تو عادل حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھے گی؟ اس مضمون کو کئی طرح ادا کیا ہے۔ کہیں یوں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور کہیں یوں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں بھی:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے ہم نے آپ نے سب نے دیکھا ہے، چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا اور اس کی کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت۔ اس منظر پر بھی کبھی نظر پڑتی ہوگی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گڑ گئی۔ آفتاب کا کام تو زندگی دینا ہے نشو و نما بخشنا ہے۔ اور بعض قدیم فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے لیکن ادھر کرن پھوٹی اُدھر شبنم کا وجود رخصت ہوگیا! کل نے جز کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کر لیا۔ ظاہر میں فنا اور واقعتاً بقا حاصل ہوگئی۔ کہتے ہیں اور فلسفہ وحدت وجود کے اندر گم ہو کر کہتے ہیں کہ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اس پر توجہ کرے اس پر تجلیٔ رحمت کا عکس ڈالے اور اسے اپنے اندر جذب کر لے۔ بندہ کا وجود یوں بھی تو مالک کے سامنے بمنزلہ عدم کے رہتا ہے:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں اک عنایت کی نظر ہونے تک

پھر یہی شربت دوسرے گلاس میں:

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو سب نے دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی محنت سب دم بھر میں غارت گئی اور جو غلہ کا انبار تھا وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا لیکن دہقاں ہی نے تو آخر دوڑ دھوپ کر کے اس آفت کا محل تیار کیا تھا اس آگ کے لیے مسالا فراہم کیا تھا:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لے ہلکی ہے دھیمے سروں میں کہتے ہیں:

منتہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے اور صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے اس کاروبار حیات کی مثل طلسمات نمود ہے حقیقتاً معدوم اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے

ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا برکلے کے نام کا گزرا ہے وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں:

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں:

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

اور پھر کہتے ہیں اور فلسفہ کی خشکی میں رنگینی پیدا کر کے کہتے ہیں:

شاید ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربہ نے معتقد اس کا بھی بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ جب تک انسان اس آب و گل کی دنیا میں ہے کچھ بھی کرے ناسوتی جھگڑے بہر حال اس کا ساتھ چھوڑنے کے نہیں۔ مرزا کی آپ بیتی ان کی ذاتی ہی نہیں نوع بشر کی آپ بیتی شعر کے موزوں سانچہ میں، لطیف قالب میں ادا تو انہی کی زبان میں ہو رہی ہے:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم ردیف وقافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ:

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے اس کی بھی بساط کیا اور پائیداری کتنی:

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے بس رقص شرر ہونے تک

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہدوں کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا جدا کر لیتے ہیں اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں، باپ، بھائی، بہن، ہمسایہ اور ہم وطن کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالب کی اصطلاح میں اس کا نام وحشت ہے اور ان کا فرمانا ہے کہ اس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے نہ کہ دوسرے:

وارفتگی بہانہ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکماء اخلاق نے لکھا ہے مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے اور اس لیے ان کے مطب میں اس کا علاج نظر کی وسعت ہے:

حسد سے دل گر افسردہ ہے سرگرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

مذہب و اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں عارفوں کے نزدیک اخلاص ہے۔ غالب بھی اسی مشرب کے پیرو ہیں۔ ان کی شریعت شعری کا فتویٰ ہے کہ وضع داری بجائے خود قابل صد قدر مستحق ہزار داد ہے:

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہل باطن کا قول ہے کہ حکمت کاملہ کو منظور ہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں فلاں حدود کو توڑ دے تو اب بندہ کا اس سے جھجکنا اور رکے رہنا خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سنیے:

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش انداز میں:

کر رہا ہوں میں اسے نامۂ اعمال میں نقل
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہی تو ہے

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نا محدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں اور جو مطلق ہے اسے کوئی مقید اپنی عقل وفہم کی گرفت میں کب لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے اور ذرا دیکھیے گا کس شاعرانہ بانکپن سے اسے اپنے انداز میں دہرایا ہے:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ جائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلّی صفات سے کب تسلی ہو سکتی ہے؟ غالب صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سُجھائی ہوئی اس حقیقت کو دہراتے ہیں اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں شاید اس لیے کہ شاید سننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالب خانقاہ کے بوریہ پر نہیں مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں:

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ سن بڑھتا گیا اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا سرتا سر مرصع، مدت العمر کے تجربات کا نچوڑ، سارے فلسفۂ حیات کا خلاصہ، روداد زندگی کا لب لباب:

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے اس قطعہ کا زمانہ صاحب غالب نامہ کی تحقیق ہے کہ 1820 ہے گویا غالب کی عمر اس وقت کل 30 سال کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیے غالب عین جوانی میں ہی بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط عبرت اور فنا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں۔ 19 جون 1863 کو یعنی اپنی وفات سے چھ سال قبل ایک خط لکھتے ہیں:

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے۔

خرم آں روز کریں منزل ویراں بردم"

منزل ویراں کی ویرانی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین چار سال قبل نومبر 1865 میں تحریر کرتے ہیں۔

نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا ہے اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں۔ "نجات کا طالب غالب" مرگ ناگہاں کا طالب غالب اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:

"زندہ ہوں مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں، بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار، غالب"۔

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا۔ زبانوں پر آج چڑھا ہوا ہے اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جا رہے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی اور اس غزل کا مطلع آپ نے بھی سن لیا ہے اب مقطع بھی سن کر فاتحہ خیر کے لیے ہاتھ اٹھا دیجیے۔ حالیؔ کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے:

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

بُوڑھا کنُوارا: بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب (متوفی 1961)

نام عبدالحق، لقب بابائے اُردو۔ وطن ہاپوڑ ضلع میرٹھ۔ عمر کا بیشتر حصہ دکن میں گزرا۔ 80 اور 90 کے درمیان عمر پائی۔ کتابیں خود کم لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں زیادہ۔ دیباچے اور مقدمے اس کثرت سے لکھے کہ لوگوں نے "مقدمہ باز" کی پھبتی جمادی! سہ ماہی رسالہ اردو اس شان و مرتبت کا نکالا، کہ اس سے پہلے کیا معنی اس کے بعد بھی ویسا نہ نکل سکا۔ اردو قواعد لکھی اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے پہلے ایڈیشن میں اردو پر ایک قابل دید مقدمہ انگریزی میں لکھا اور اخیر عمر میں لغت کبیر کے نام سے اردو لغت اتنی فاضلانہ اور مفصل لکھی کہ فرد واحد سے اس کمیت اور اس کیفیت کی کتاب کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کے سہ ماہی اردو میں اس کی قسطیں نکل رہی ہیں۔

علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ ضعیفی میں الہ آباد یونیورسٹی نے آنریری ڈگری پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی عطا کی۔ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی نے آنریری ڈگری ڈی لٹ کی دی۔ شروع سے ''مملکت آصفیہ'' کے سررشتۂ تعلیمات میں داخل ہو گئے اور کچھ دن بعد اورنگ آباد میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اردو کی خدمت کر کر کے اور نام پیدا کرتے گئے۔ 1912 کے اخیر سے انجمن ترقی اردو کا کام ہاتھ میں لیا اور اس کے سکتر ہو کر اُسی کے ہو کر رہ گئے۔ ایک اس کام کے پیچھے دن رات ایک کرتے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ کے کرتا دھرتا بھی رہے اور اُس کے ناظم کی حیثیت سے بھی رہے۔ مصطلحات علمی کی جو مجلس تھی، اس میں خوب گرما گرم بحثیں ہوتیں اور نوبت ذاتیات کی آجاتی۔ سائنس کی ایک ایک اصطلاح کے گڑھنے میں

لو ہے لگ جاتے ایک طرف مولانا حمید الدین فراہی ہوتے اور وحید الدین سلیم، دوسری طرف مرزا کوکب اور سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ جھگڑے ہوتے، چوٹیں چلتیں اور ثالث اکثر یہی عبدالحق بنتے۔ اس نظامتِ سر رشتہ ترجمہ سے ترقی کر کے جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر ہو کر آ گئے۔ اور پھر جب اس سے بھی ریٹائر ہوئے تو منتقل ہو کر دہلی آ ئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ جیسے بجائے بوڑھے ہونے کے اور زیادہ جوان ہو گئے ہیں! ہمت و مستعدی، بیدار مغزی اور کارکردگی میں اچھے اچھوں کے چھکّے چھڑا دیتے — بے چارے نے بہت چاہا کہ سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ ہو کر خدمت اردو کے لیے اپنے کو وقف رکھیں، اسی پر جئیں اور اسی پر دُنیا سے اُٹھیں، پوری طرح کامیاب نہ ہو پائے۔ پاسپورٹ ہند پاکستان دونوں کے بنوا لیے۔ بہت چاہا کہ ایک قدم دہلی اور علی گڑھ میں رکھیں، دوسرا کراچی و لاہور میں لیکن دونوں ملکوں میں کام کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ مجبوراً اپنے کو کراچی میں محصور کر لیا۔ طوفانی دوروں سے ڈھاکہ اور چاٹگام تک کو ہلا ڈالا۔ سرگرم جوش عمل سے مُردوں کو جلا دیا۔ کتنوں کو گمنامی کے قعر سے گھسیٹ کر بام شہرت پر لے آئے۔ کتنوں کے نام چمکا دیے۔ فلک کج رفتار کو اس کی ناموری نہ بھائی اور اپنوں ہی نے مخالفت کی ٹھان لی۔ وہ ایک ہمت کا دھنی کسی سے ہار نہ مانا تن تنہا سب سے مقابلہ کرتا رہا، ایک ایک سے ٹکر لیتا رہا۔ عمر کی 80 سے زائد منزلیں طے کر کے عالم آخرت کو سدھارا۔ دنیا اس کی تحقیق کی داد دیتی رہے گی اور نسلیں اس کے عزم و فرض شناسی کی بلائیں لیتی رہیں گی۔

عمر بھر شادی نہ کی، تجرد میں گزاری۔ سالہا سال ایک محبوبہ دِل نواز کی چاہت میں گزار دیے۔

زندگی اُس پر تج دی، دن رات اس کے فراق میں گرفتار، نہ یہاں قیام۔ نہ وہاں قرار:

دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق۔ بہ قول کسی عامی سیلانی کے:

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے
جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر ہم ہیں!

اس بے پناہ عشق و اشتیاق و اُلفت کی دُھن میں ایجاب و قبول کی فکر اور قاضی اور شاہدین کا ہوش کہاں! محبوبہ کا نام ہے زبان اردو، اور اس پر دل دینے والے کا نام عبدالحق بوڑھا کنوارا۔ بس نام ہی کا کنوارا نکلا۔ عبدالحق نے جتنی گہری اور جتنی وسیع خدمت اُردو کی کی، اگر اس کا جائزہ لینے

پر آیئے تو خود ایک عمر کی چھان بین اور برسوں کی مشقت کی ضرورت ہے۔ دیکھیے کب اور کون اتنی ہمت کر پائے!

دوستوں بلکہ دشمنوں تک کے کام آنے والا غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہنچانے والا، خود اچھا کھانے والا۔ اس سے بڑھ کر دوسروں کو اچھا کھلانے والا۔ بے غرض خدمت گزاری کا پُتلا خدمت خلق ہی کو اپنا مذہب بنا لینے والا۔ کوئی شریف انسان عبدالحق کا سا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے اور یقین ہے کہ جب دنیا میں اس کا وقت موعود آیا تو توحید اور رسالت کی گواہی دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔ انہی کے ہم نام اور بہترین مسلمان۔ افضل العلماء عبدالحق کرنولی ثم مدراسی مرحوم نے، مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں بابائے اُردو اور فلاں مولوی صاحب کے ہمراہ ادیار (مدراس) کے تھیا سوفسٹ باغ میں جب مغرب کے وقت گزرا تو بابائے اُردو نے کہا کہ یہاں تو نماز ضرور پڑھی جائے اور اس کے بعد خود ہی نماز کی اذان دی اور نماز مغرب جماعت کے ساتھ انہی مولوی صاحب کے پیچھے ادا کی۔

مفتی صاحب (مفتی کفایت اللہؒ صاحب)

دہلی کی خبر ہے کہ جس وقت سال عیسوی رخصت ہو رہا تھا 31 دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب میں (شب پنجشنبہ) کو مفتی صاحب نے رحلت فرمائی إنا للہ، کون مفتی صاحب؟ مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیۃ العلماء، آج سے 25-30 قبل جب خلافت کمیٹی کا دور عروج تھا۔ مطلق مفتی صاحب سے مراد یہی مفتی شریعت ہوتے تھے نام لینے کی حاجت بھی نہ تھی اور اس کے بعد بھی مدّتوں یہی حال رہا۔

علالت اور نازک حالت کی خبریں ہفتوں سے آ رہی تھیں اس لیے دل اس آخری خبر سننے کے لیے بھی تیار تھا لیکن اس تیاری سے بھی واقعہ کی اہمیت اور صدمہ کی شدّت میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔ فقیہ آج ہر وہ شخص سمجھا جاتا جسے عالمگیری، شامی وغیرہ کے جزئیات حفظ ہوں۔ مفتی صاحب مرحوم اس عامیانہ مفہوم میں نہیں بلکہ واقعتاً فقیہ تھے یعنی شریعت کے بڑے چھوٹے ہر مسئلہ میں تفقہ سے کام لینے والے اور اُن کی ذہانت ایسی تھی جیسے امام ابو حنیفہؒ کے ایک شاگرد رشید کی ہونا چاہیے۔ باریک مسائل کی تہہ تک وہ بات کی بات میں پہنچ جاتے۔ خلافت کمیٹی مرکزی کے جلسوں میں بارہا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کسی مسئلہ میں شدید اختلاف ہے اور دونوں فریق

ایک دوسرے کے خلاف بُری طرح اُلجھے ہوتے ہیں کہ مفتی صاحب نے ادھر توجہ فرمائی اور چند منٹ کے اندر ایسا آسان حل نکال دیا کہ جس پر فریقین بہ خوشی متحد ہو گئے اور ان کے رسالے تعلیم الاسلام کے نام سے گو بہ ظاہر صرف مبتدیوں کے لیے ہیں لیکن درحقیقت منتہیوں کے کام کے ہیں۔ایک بڑی بات یہ تھی کہ باوجود پختہ نیشنلسٹ اور قوم پرور ہونے کے وہ اپنی اسلامیت اور اپنے عقائد میں بھی متشدد آخر تک رہے۔ یہ نہ ہونے پایا کہ سیاست کی رَو میں بہہ کر اپنے مقتضیات و مطالبات ایمانی میں کسی قسم کا ڈھیلا پن آجانے دیا ہو اور یہ وصف ایسا ہے جو اُن کے معاصرین میں کمتر ہی کسی میں پایا جاتا ہے جوش اور ہوش غیرت ایمانی اور فہم و فراست وتدبّر کا اتنا خوشگوار امتزاج بھی نادراً ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے۔تواضع وانکسار، خوش خلقی، مہمان نوازی وغیرہ کے اوصاف حسنہ اس پر مستزاد۔ حالات سے بددل ہو کر ایک عرصہ سے گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔عمر 75 اور 80 کے درمیان تھی۔ بحثیت مجموعی اپنے کمالات کے لحاظ سے اپنی نظیر بس آپ تھے۔ اللہ بلند سے بلند مراتب سے سرفراز فرمائے۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم

آج سے 24 سال قبل 1912 ترکی پر دشمنوں کی یورش تھی، جنگ طرابلس پوری طرح ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ بلقان کی چھوٹی بڑی ساری سلطنتیں یلغار کر کے ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام دنیا نے اوّل اوّل اس وقت سنا اور چند ہی روز میں لوگ پورا نام تو بھول بھال گئے زبانوں پر صرف اور صرف ''ڈاکٹر انصاری'' ہی چڑھا رہ گیا۔محمد علی کی تحریک پر طبّی وفد لے کر ترکی گئے کامریڈ میں ہر ہفتہ ذکر خیر ہوتا رہا۔محمد علی کی زبان وقلم دونوں ان کی تائید کے لیے وقف تھے وہ دن اور آج، اس بہادر کا قدم، قومیات کے میدان میں پیچھے نہ ہٹا۔ تا آنکہ 10 مئی [1936] کو اپنی مدت حیات عالم ناسوت میں پوری کر، اپنے رب کے حضور میں بلالیے گئے۔ اللہ نے دولت وافر دی تھی۔ دست کرم کی فیاضیاں کچھ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں۔ لاکھوں، لوگوں کے کھلانے پلانے میں، غریبوں کی مدد کرنے میں اٹھادیے۔لق ودق کوٹھی ایک مستقل مہمان سرا تھی جب دیکھیے مہمانوں سے بھری ہوئی جو صاحب اسٹیشن پر اترے بس سیدھے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا رخ کر دیا۔قوم وملت کے پیچھے ہر طرح کے دُکھ درد اٹھائے۔آمدنی کا نقصان گوارہ کیا۔جیل گئے سب کچھ ہوا مگر اپنی آن میں فرق نہ آنے دیا۔تحریک خلافت کے

شباب میں خلافت کے لیے خوب خوب کام کیے۔ جامعہ ملیہ کی سرپرستی آخردم تک قائم رکھی۔ جوان سے بوڑھے ہوئے لیکن ہمت بدستور جوان ہی رہی۔ قوائے جسمانی ضعیف ہوئے لیکن قومی خدمت گزاری کی قوت اور ولولہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ 11 مئی کی صبح بھی قیامت کی صبح تھی۔ صدہا مریض آس لگائے بیٹھے تھے کہ مسیحائے وقت سے دوالیں گے، نسخہ لکھائیں گے۔ بجائے اس طبیب حاذق کے ٹرین سے طبیب کی لاش آئی۔ آہ ! انسانی آرزوؤں کی پامالی۔ انسان امید کیا لگاتا ہے اور ہو کر کیا رہتا ہے؟ اور آہ! بشری کمالات کی بے حقیقتی جو دوسروں کی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا تھا اپنے آئے ہوئے وقت کو ایک منٹ کے لیے نہ ٹال سکا۔ حق تعالیٰ درجات عالیہ نصیب فرمائے۔

راشدُ الخیری (متوفی 1936)

ٹریجڈی یا غم نگاری کے بادشاہ تھے میں نے جب دہلی جاکر دیکھا تو سن سفید ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہاتھ پیر کے، ڈیل ڈول کے اچھے خاصے تھے۔ جوانی میں ڈنڈ پیل کسرتی رہے ہوں گے۔ پرانی تصویروں کا کینڈا کہے دیتا تھا۔

نذیر احمد مترجم القرآن ان کے عزیز قریب تھے، شاید ان کی بیوی کے یہ بھتیجے تھے۔ زبان سیکھنے کے لیے دہلی سے کہیں باہر جانا نہ تھا اور دہلی میں بھی محلہ کوچہ چیلان (چیلان 'میں ''ن'' کو دبا کر نہ پڑھیے۔ یہ ن جمع کی علامت چیل کی نہیں "چیلے" کی ہے) اپنی ذاتی صلاحیت اس پر نذیر احمد کی صحبت، سونے پر سہاگہ، یہ بھی چل نکلے۔ اور پھر لکھوانے والے، بہلانے والے، پھسلانے والے ملّا واحدی '' چل نکلے'' نہیں، اُڑ چلے، نشہ سہ آتشہ ہوگیا۔ پہلے کچھ افسانے لکھے اور رسالوں میں چھپوائے۔ پھر ناول تابڑ توڑ لکھنے شروع کردیے۔ جوہر قدامت، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی نوحۂ زندگی وغیرہ۔ پبلک نے قدردانی کی، یہ جام پر جام چڑھاتے چلے گئے:

ساقی جو دیے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا
تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

تعلیم نسواں کے ابتدائی گنہگاروں میں تھے بڑے ٹھسّے سے ماہنامہ عصمت نکالا۔ چلے تھے شرافت کا درس دینے، اسلامیت کو ازسرِنو زندہ کرنے، دیکھتے ہی دیکھتے بات قابو سے باہر ہوگئی حجاب وعصمت نہیں۔ تبرج، بے حجابی، فسق، عریانی ہی مقصود بن گئی اور جو کل تک آگے بڑھنے والا

تھا، راہ دکھانے والا تھا، اس کا شمار رجعت پسندوں میں، قدامت پرستوں میں ہونے لگا اور یہی دنیا میں ہوا رہتا ہے۔

دین کی خدمت کوئی تفسیر و حدیث کی راہ سے کرتا ہے۔ کوئی کلام و مناظرے کے راستے سے۔ راشد الخیری کی فسانہ نگاری بجائے خود ایک عبادت تھی اور ان کا جھوٹ تمامتر سچ ہی تھا۔ عجب کیا جو ان کی مغفرت کے لیے ان کے ناولوں کے چند ہی ورق کافی ہو گئے ہوں۔ ہر ناول کا ماحصل یہی نکلتا تھا کہ آخرت کی یاد تازہ کر دیں۔ اور پڑھنے والے کو خوف خدا سے رُلا چھوڑیں۔

1918 تھا اور میرے اوپر الحاد و بے دینی کا عفریت سوار تھا اور بڑے سے بڑے طبعی صدمے کو بھی دل کی کمزوری ہی سمجھتا تھا۔ ایک روز کیا ہوا کہ شب زندگی پڑھنے کو لے بیٹھا۔ شروع کرنا تھا کہ معلوم ہوا سوتا پھوٹ پڑا، صبر کا زعم، ضبط کا غرّہ ٹوٹ گیا۔ بڑی خیر ہوگئی کہ کمرے کے اندر کوئی اور نہ تھا۔ بڑی شرم اس کی تھی کہ اس غم زدگی کی حالت میں کوئی دیکھ نہ لے غم ناکی اور اثر انگیزی اس بلا کی کہ سطر سطر پر طبیعت آخرت کے لیے گرمائے۔ بڑے بڑے واعظ اور اہل دل کی صحبت میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ طبیعت کا سوز و گداز بڑھ جاتا ہے۔

1924 کی آخری سہ ماہی تھی مولانا محمد علی کا کامریڈ اور ہمدرد دونوں محمد علی کی ادارت میں کوچہ چیلان سے دوبارہ نکلنے شروع ہو گئے۔ واحدی صاحب کا دفتر چند قدم پر تھا۔ راشد الخیری سے وہیں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ وہیں اکثر آتے رہتے اور کبھی کبھی تو مولانا محمد علی کے ہاں بھی آجاتے۔ مولانا ان کی بڑی قدر کرتے اور نام رکھ دینے میں تو انھیں ملکہ تھا ہی، اُن کا نام ''دُکھیا'' رکھ دیا تھا۔

میرا اس وقت سے 1929 کے شروع تک دہلی جانا اور راشد الخیری سے ملنا ملانا ہوتا رہا۔ بلکہ ایک آدھ مرتبہ تو ان کے ہاں دعوت بھی کھائی۔ اپنے مدرسے (مدرسۃ البنات) میں ایسے منہمک و مطمئن رہتے، گویا اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہو۔ اور اسکول کی لڑکیوں کو اپنی ہی بچیاں سمجھتے۔ وہ خود بھی اور ان کی بیگم صاحبہ بھی۔ خوش اطوار، خوش مزاج، رقیق القلب، رحمدل، ہمدرد، متواضع، سادگی پسند، اور تمکنت سے خالی انسان تھے۔ قلم سے جو لکھتے تھے، وہی دل میں بھی رکھتے تھے۔ جو راستہ دوسروں کو دکھاتے۔ اس پر خود بھی گامزن تھے۔ تحریریں دل کے تقاضے سے تحریر کرتے، آرٹ کی نمائش مقصود نہ ہوتی۔ صاحب قال نہ تھے، صاحب حال تھے۔ رومی روشن ضمیر (کاروان عشق و مستی کے امیر) نے اخلاق و تہذیب کے بہترین سبق حکایت و افسانے کے ذریعہ سے تو

دیے ہیں یہاں تک کہ فحش بیانی سے بھی کام لیا ہے۔ پھر آخر راشد غریب نے کیا قصور کیا، جو کہانیوں اور آپ بیتیوں سے کام حکمت و موعظت کی بزم میں لیا اور حدیث دیگراں میں "سر دلبراں" کو سمو دیا؟ کمال در کمال یہ کہ ان کی بیان کی ہوئی داستانیں اتنی صاف ستھری، شریفانہ، دلچسپ اور دل آویز ہوتیں، سب ہی ان کو سنتے اور سب ہی کو یہ سناتے۔ قابل فخر و نازش ہے اُردو زبان کہ اُسے راشد الخیری سا عبرت آموز و دردمند اہل قلم نصیب ہوا!

خواجہ حسن نظامی (متوفی 1955)

ابھی اسکول کے کسی درجہ کا طالب علم ہی تھا کہ یہ نام بہ حیثیت مضمون نگار کے کان میں پڑنے لگا، کالج میں تھا کہ مولانا شبلی کی زبان سے ان کی "بھاشا آمیز اردو" کی تعریف سنی۔ دل پہلے ہی سے ان کی طرف کھنچا ہوا تھا کہ اب تو اتنی بڑی سند بھی ہاتھ آ گئی۔ اور ایک مضمون کی تمہید میں مولانا ابوالکلام کے قلم سے بھی ان کی مدح دیکھی۔ مولانا شبلی کی داد بجائے خود کیا کم تھی، کہ اب وہ شہادت اور موثق ہو گئی۔ ان کا ہر مضمون، ہر اخبار شوق و اشتیاق سے پڑھنے لگا۔

1913 میں ایک بار دہلی جانا ہوا، اتفاق سے آگے تانگہ خواجہ صاحب کا جا رہا تھا، نظر پڑتے ہی پہچان لیا، تصویریں بار بار دیکھ چکا تھا، اور زُلفوں والا چہرہ بھولنے والا نہ تھا۔ اب یہ یاد نہیں پڑتا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً دہلی ہی میں ہوئی۔ میں پرانی دہلی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہیں ہوئی سن بھی کوئی 14 یا 15 ہو گا اور تھوڑے ہی دن میں تعلقات یگانگت کی حد تک پہنچ گئے۔ مزے مزے کے خط آتے، ان کی بزرگی اور درویشی کا میں کچھ زیادہ قائل نہ ہو سکا، لیکن ان کے صاحب قلم ہونے کا احساس برابر بڑھتا رہا۔ ادیب تو اُردو میں بہت دیکھنے میں آئے۔ لیکن خواجہ صاحب، صاحب طرز تھے اور سلیس اردو، صحیح، عام فہم زبان لکھنے میں انھیں ملکہ تھا۔

پیرزادگی اور صوفیت کا کاروبار ان کے ہاں بڑے پیمانے پر جاری رہا۔ یہ قول بعض خوش عقیدہ مریدوں کے ہیں:

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں!

البتہ ان کی انشا پردازی کا سکہ دل پر اور زیادہ ہی بیٹھتا رہا اور ادب اردو کے اُن ظالم تاریخ نگاروں پر غصہ اور افسوس ہی کرتا رہا، جنھوں نے خواجہ صاحب کے ذکر سے اپنی تاریخوں میں پرہیز کیا ہے۔ ایک زمانہ مجھ پر ایسا گزرا ہے جب میں حضرت نظام الدین سلطان المشائخ کا

غیر معمولی طور پر معتقد تھا۔ اسی سلسلے میں ایک سے زائد بار دہلی حاضر ہو کر خواجہ صاحب کا نمک خوار بننا پڑا اور ایک مرتبہ تو غالباً 1922 کے اخیر میں خواجہ صاحب کا مہمان مستقل 30، 35 دن تک رہا۔ گیا اس ارادے سے تھا کہ خواجہ صاحب سے صرف جگہ کا طالب ہو کر اپنا کھانا پینا الگ رکھوں گا اور اسی خیال سے کھانا پکانے کے لیے آدمی بھی ساتھ لے گیا اور ساتھ ہی کچھ برتن بھی، مگر خواجہ صاحب کسی طرح نہ مانے، آخر میں مجھی کو ہار ماننا پڑی۔ ساری مدّت خواجہ صاحب نے جس سیر چشمی سے اپنا مہمان رکھا اس کی یاد بھی جب آجاتی ہے، نظریں شکر گزاری اور احسان مندی کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ جب عرس کا زمانہ آگیا اور میری واپسی کو کوئی عشرہ باقی رہ گیا، تو میری بیوی بھی آگئیں۔ ایک لڑکی اور اس کی انّا بھی ساتھ تھیں۔ یہ چار پانچ آدمیوں کا قافلہ پوری شان بے تکلفی سے خواجہ صاحب کا مہمان بنا رہا۔ 1918 میں خواجہ صاحب سے حیدرآباد میں بھی ملاقات رہی۔ وہاں وہ بڑے لوگوں (مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری وغیرہ) کے ہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے، اور میں سررشتہ تالیف وترجمہ میں ایک معمولی سا عہدہ دار تھا۔ حیدرآباد میں یہ معاشی اونچ نیچ بہت دیکھی جاتی تھی۔ اور کوئی ''بڑا'' کسی ''چھوٹے'' کے ہاں آنے میں اپنی بڑی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کا ذرا خیال نہ کیا اور پتہ لگا کر خود ہی ایک دم سے میرے گھر آگئے۔ کہیں اور اہم ہو یا نہ ہو حیدرآباد میں یہ بہت اہم تھا۔ خواجہ صاحب کی تنہا یہی ایک ادا انھیں بڑا بنا دینے کے لیے کافی تھی۔

خواجہ صاحب صحیح معنی میں ایک خود ساختہ (Self Made) آدمی تھے، انھوں نے نہ اپنی پیرزادگی پر تکیہ کیا، نہ رسمی سجادگی کے پھیر میں پڑے۔ بلکہ اپنی محنت وجانفشانی سے، اپنی حکمت و تدبیر سے معاشرے میں اونچی جگہ پیدا کر لی۔ اور کسی اونچی سی اونچی شخصیت سے ہیٹے نہ رہے۔

بحیثیت مجموعی وہ بڑے بامروت، خوش اخلاق، مہمان نواز اور بڑے دلچسپ وباغ و بہار آدمی تھے۔ عقل دنیا بھی خوب رکھتے تھے حضرت اکبر الہ آبادی سے نیازمندی میں میرے کامیاب حریف تھے، وہ شعر ملاحظ ہو:

حسن نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو تو خرقہ پوش ہوتا

ایک حسن نظامی یہ تھے، میرے دوست اور مخلص، محسن وعنایت فرما، متواضع و منکسر، فیاض و مہمان نواز، اردو کے مایہ ناز انشا پرداز، لیکن ایک دوسرے حسن نظامی بھی تھے دینی شخصیتوں (مثلاً

امام بخاری) کی توہین کرنے میں اہل سنت کی دل آزاری کی پروانہ کرتے اور مجاہد امت اور پیشوائے ملت محمد علی مرحوم کو نیچا دکھانے میں ناگفتہ بہ حدود تک پہنچ جاتے۔ان دوسرے حسن نظامی کا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالے کرتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ ان کی خوبیوں اور ان کی شان جمالی کے طفیل میں ان کی لغزشوں اور بشری کمزوریوں کو دامن عفو میں ڈھانپ لیا جائے اور ان کی نیکیوں کو ان کا شافع بنالیا جائے اور اپنے دلچسپ دوست کے حق میں توقع رکھے ہوئے ہوں کہ انشاء اللہ جنت میں ضرور ان کی دلچسپ گفتگو لطف دے گی۔

مُلّا واحدی (متوفی 1974)

مُلّا واحدی کا نام برسوں سے سننے میں آرہا تھا، بحیثیت خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید اور مُبلّغ اور رفیق وشریک ہونے کے۔

ملاقات غالباً 1923 کے آخر میں ہوئی۔اکتوبر 1924 سے مولانا محمد علی نے اپنا روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی سے ازسرنو جاری کیا۔واحدی صاحب اسی کوچہ چیلان میں ہمدرد سے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہتے تھے اس وقت سے میرا دہلی بار بار جانا ہونے لگا، جب ہی سے واحدی صاحب سے پینگ بڑھے۔جاڑوں کے موسم میں صبح ان کے ہاں نہاری کی دعوت ہوتی تھی۔دہلی کی نہاری یوں بھی مشہور تھی، واحدی صاحب اس کی مرچ کی تیزی رفع کرنے کو گھر میں ایک بار پھر گھی سے (اور اس وقت تک خالص گھی نایاب نہیں تھا) بگھار دیتے تھے، مجھ سے کھلنے لگے بڑے مخلص حلیم، خوش تدبیر، متواضع اور بڑی سوجھ بوجھ کے نکلے۔

اگست 1947 کے انقلاب عظیم نے ان کے سے دہلی پرست کے بھی پاؤں دہلی سے اکھاڑ دیے۔اور وہ دہلوی سے پاکستانی ہوگئے۔دہلی میں پرانے میونسپل کمشنر تھے۔اور اپنے حلقے کے مسلمانوں ہی میں نہیں، ہندوؤں میں بھی خوب مقبول رہے۔دہلی کی اینٹ اینٹ سے انھیں وابستگی اور محبت تھی، خدا جانے کن مجبوریوں سے انھوں نے وطن چھوڑا ہوگا اور وطن چھوڑتے وقت ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

پاکستان جاکر اُن کے قلم میں مزید توانائی آگئی اور توانائی ہی نہیں رہنمائی بھی خوب خوب باتیں کام کی لکھنے لگے، دنیا وآخرت دونوں میں کام آنے والی نصیحت کی باتیں بڑوں اور چھوٹوں، مردوں اور عورتوں سب کے لیے اور بڑے ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں، خشکی کا نام ونشان

نہیں۔ گویا شیخ سعدی گلستاں لکھ رہے تھے! زبان دہلی کی ٹکسالی۔ اور انداز بیان دلفریب و دلگداز دونوں۔ ایک سے زائد پرچے بھی نکالے، مگر سب بند ہو گئے۔ اور پاکستان کی ڈاک تو ادھر چار برس سے بند ہے۔ ان کے مضمون ماہنامہ منادی (دہلی) میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔

ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں میں ہونا چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے نہ وہ کسی پارٹی میں شامل اور نہ کسی تاریخ ادب کے صفحات میں ان کا نام آتا ہے، یہ بڑی حق تلفی ان کی ہو رہی ہے، اور وہ یقیناً مظلوموں میں ہیں۔ مظلوم ان سے بھی بڑھ کر خواجہ حسن نظامی دہلوی اور آغا حیدر حسن دہلوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بھی تھے۔ زبان ان سب کی سند اور ان کا ہر قول انشا پردازی کے دربار میں مُستند ہے۔

خدائے واحد واحدی کا دم قائم رکھے دین و اخلاق دونوں کی خدمت وہ اپنے میٹھے بولوں سے کر رہے ہیں۔

سیّد ہاشمی (متوفی-1964)

رہنے والے فرید آباد (نواح دہلی) کے۔ فرید آباد وہی جہاں کے مرزا قتیل مشہور ہوئے ہیں۔ (صاحب رقعاتِ مرزا قتیل) ان کی ایک حقیقی خالہ دریاباد میں بیاہی ہوئی تھیں۔ مرزا یوسف بیگ مرحوم کو غالباً 1914 تھا جب ان سے ملاقات لکھنؤ میں ہوئی (اور وہ زمانہ میرے مستقل قیام لکھنؤ کا تھا) ظفر الملک علوی کاکوری ماہنامہ الناظر نکال رہے تھے۔ میں اس میں مقالہ نگاری کیا کرتا تھا۔ یہ آئے اور وہیں مقیم رہے۔ ایک بار پہلے آگرہ میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ بابائے اُردو عبدالحق کے ساتھ ساتھ تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اس سال وہیں ہوا تھا، کانفرنس تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سالانہ میلہ تھا۔

پھر حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس کا پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ تھا۔ اس میں یونیورسٹی کے لیے کتابیں تیار ہو رہی تھیں۔ اس میں فلسفے کے شعبے میں میں بلایا گیا تھا۔ اور تاریخ کے شعبے میں سید ہاشمی (سیاسیات و تاریخ کے شعبے میں قاضی تلمذ حسین گورکھپوری۔ ایم اے علیگ) یہ زمانہ ستمبر 1917 سے لے کر اخیر جولائی 1918 تک رہا ایک کمرہ میرا تھا، ایک ہاشمی صاحب کا، کام بھی ہوتا تھا اور خوش گپیاں بھی۔ عقائد و خیالات میں بُعد المشرقین تھا۔ میں تشکیک اور الحاد کے مرض میں مبتلا تھا، ہاشمی صاحب اس وقت بھی پورے مذہبی تھے، بلکہ شاید کسی بھوپالی

نقشبندی شیخ کے مرید بھی تھے۔ اخلاص فریقین کی طرف سے تھا، اس لیے کبھی بحث ومباحثے میں نوک جھونک ہو کر رہتی نوبت جنگ وجدال کی نہیں آتی۔ زندہ دلی اور طباعی ہاشمی کے روئیں روئیں سے ٹپکتی تھی۔ لکھتے خوب تھے، بالکل دلّی والوں کے رنگ میں۔ مزاج وخصائل، وضع وشمائل تک میں دہلوی ادیبوں کا رنگ ٹپکتا تھا۔ کتابیں تاریخ کی لکھتے لیکن آدمی تاریخ کے نہیں، ادب وانشا کے تھے میں کہا کرتا تھا کہ ''قدرت نے آپ کو ادیب بنا کر بھیجا تھا، زبردستی اپنے کو مؤرخ بنالیا''۔ نچلے بیٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ ابھی کسی پر فقرہ چست کیا ابھی کسی روتے کو ہنسا دیا۔ پاکستان بننے پر وہیں منتقل ہو گئے۔ 1955 میں جب کراچی و لاہور اور اخیر 1957 میں جب صرف لاہور گیا، تو دونوں بار ملاقاتیں رہیں۔ مذہب اور عبادت گزاری کے ساتھ ساتھ ترقی، زندہ دلی اور ہنسوڑپن میں بھی پائی، لکھتے بڑی تیزی سے تھے۔ گویا مشین ہاتھ میں لگی ہوئی ہے۔ اور خط بھی ان کی طبیعت کی طرح بڑا پاکیزہ تھا۔ بابائے اردو عبدالحق کے خاص منظور نظر تھے۔ میں نے جب پہلی بار دیکھا ہے، تو داڑھی نکل آئی تھی۔ اس لیے امرد پرستی کی بدگمانی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسلام کے ہی بعض معلوم ومعروف فرقوں سے، بہت خفا رہتے تھے۔

سیاسی خیالات میں انگریزوں سے بیزاری شروع ہی سے تھی، غالباً 1914 میں علی گڑھ سے بی۔ اے کر رہے تھے۔ پرنسپل اس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد تھے۔ انہی کے عہد میں کالج سے اخراج ہو گیا تھا۔ حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں یورپ بھی کسی تقریب سے ہو آئے تھے۔ اللہ تُربت ٹھنڈی رکھے۔

محمد علی (متوفی 1931)

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا!

لڑکپن کے شروع کا کوئی زمانہ تھا۔ نام سے ابتدائی تعارف اُسی وقت ہو گیا، علی گڑھ میگزین کے نام سے کالج کا ماہ نامہ آدھا انگریزی آدھا اُردو میں نکلتا تھا۔ یہ محمد علی اس وقت تک ولایت جا چکے تھے، یا جانے والے تھے، کہ ان کا نام اس کے صفحات میں بہ طور پڑھنے والے یا کرکٹ کھیلنے والے کے نظر پڑا۔ اُردو تو اُس وقت تک میں پڑھ لینے لگا تھا، اور انگریزی میں بھی کچھ شُد بُد ہو چلی تھی۔ چچا زاد بھائی عبدالحلیم اثر نامی خدا معلوم کہاں کہاں اخبار اور رسالے لالا کر دکھایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ منتھلی میگزین بھی دیکھا اور اس میں ان کا نام بھی۔ اس کے کسی پرچے

میں یہ بھی پڑھا (غالباً 1900 میں) کہ محمد علی نامی علی گڑھ کا ایک ذہین وفطین لڑکا علی گڑھ سے اب آکسفورڈ یونیورسٹی گیا اور وہاں بھی نام پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی ایک انگریزی نظم بھی علی گڑھ کرکٹ پر پڑھی۔ ایک شعر کا مضمون یہ تھا کہ جب کیم وشحیم (Bulky) شوکت علی فیلڈ میں آتے ہیں تو کرکٹ کا بلا اُن کے ہاتھ میں Pen نظر آتا ہے۔!

روایتیں سنتا رہا اور پڑھتا رہا۔ ملاقات ومکالمت کا شوق ہر قدم پر بڑھتا رہا۔ کامریڈ کلکتہ سے 1911 میں نکلا اور اسے شروع ہی سے منگانا شروع کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو اس کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جلسہ راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں انہی کی کوٹھی واقع قیصر باغ میں منعقد ہوا۔ دس پانچ تماشائی بھی جا بیٹھے، انہی میں ایک میں بھی تھا۔ راجہ صاحب کے ہاں کے لوگ کچھ جانتے پہچانتے بھی تھے۔ تو پہلی زیارت یوں ہوئی۔

امین آباد پارک نیا نیا بنا تھا۔ اُس کے ایک بالا خانے پر ایک ''مسلم کلب'' سید میر جان فرخ آبادی نے قائم کر دیا تھا۔ انہی میر جان صاحب نے شام کے بعد مغرب کلب میں انھیں بھی (دوسرے مہمانوں کے ساتھ) بُلا دیا تھا۔ اور وہاں انھیں قریب سے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔

1912 میں کامریڈ کلکتے سے منتقل ہو کر دہلی آگیا اور اردو روزنامہ ہمدرد بھی یہیں سے نکلنا شروع ہو گیا۔ اسٹاف میں جو لوگ تھے وہ اپنے جاننے والوں میں سے تھے مضمون کی فرمائش آئی۔ مِل (انگریز فلسفی) کے عاشقوں میں اس وقت تھا۔ اس کی لبرٹی (Liberty) کے ایک باب کا ترجمہ کر کے بھیجا۔ یقیناً خشک معلوم ہوا ہو گا۔ کسی صاحب کا جواب محمد علی کے حکم پر آیا کہ ''ترجمہ نہیں، اس مفہوم کو اردو میں اپنا کر بھیجو''۔

اخیر دسمبر 1912 میں لکھنؤ میں جلسے ہوئے۔ کانفرنس کے اور یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے بھی۔ ملاقات کا تو کیا چلتی پھرتی علیک سلیک کا موقع بھی نہ ہاتھ آتا۔

1913 تھا اور غالباً برسات کا زمانہ، اب میں ملازمت کی تلاش میں تھا۔ ریلوے میں کوئی اچھی اور نئی جگہ نکلی تھی۔ ولایت علی قدوائی مسولوی (علی گڑھ کی زبان میں ''بمبوق'') بارہ بنکی میں وکیل تھے، محمد علی کے شیدائی اور کامریڈ کے مستقل مضمون نگار۔ اُن سے تعارف نامہ لیا اور دہلی پہنچا کہ محمد علی کسی بڑے افسر سے سفارش کر دیں۔ اور دن بھر انہی کا مہمان رہا۔ رمضان کا مہینہ تھا، محمد علی قدرتاً روزے سے تھے، مجھ اس وقت کے مُلحد کو اس کی توفیق کہاں تھی۔ میرے لیے ناشتہ اور کھانا سب اپنے اپنے وقت پر موجود۔

کامریڈ سے میرا عشق بڑھتا رہا اور ہمدرد سے بھی جو تعلق ہوا وہ ترقی ہی پر رہا۔ فاروق (دیوانہ) گورکھپور والے، سید محفوظ علی، سید جالب دہلوی اور قاضی عبدالغفار کئی کئی اسسٹنٹ ہمدرد میں تھے۔ محمد علی خود تو موقع بہت کم ہمدرد میں لکھنے کا پاتے، لکھوا اکثر دیتے۔ اسٹاف والوں میں سے کسی کو بلا کر اُسے سارے مطالب بتلا دیتے اور پھر اس کے لکھے ہوئے مقالب کا جائزہ بھی سختی سے لیتے۔ کم ہی کوئی ان کے معیار پر پورا اُترتا۔ کامریڈ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر غلام حسین تھے۔ علی گڑھ کے ایک پنجابی گریجویٹ، وہ محمد علی کو خاص طور پر عزیز تھے۔ انگریزی مزاحیہ لکھنے والوں میں ولایت علی بمبوق تھے۔ اردو مزاحیہ نگاروں میں سید محفوظ علی بدایونی تھے۔ مزاح نگاری میں اردو والوں کو صحیح راہ پر لگانے والے یہی تھے۔ ورنہ اس سے پہلے اودھ پنچ کا رنگ عام تھا۔ شکل وصورت، وطن، نسل، سب پر پھبتی اور کبھی کبھی نوبت پھکڑ کی بھی آجاتی۔ پہلی جنگ یورپ 1914 میں شروع ہو چکی تھی اور حکومت ہمیشہ سے زیادہ ذکی الحس ہو گئی تھی۔ لندن کے مشہور روزنامہ ٹائمز نے ایک مضمون Choice of the Turks لکھ کر ترکی کو جرمنی کی طرف سے شرکت جنگ سے ڈرایا دھمکایا تھا۔ محمد علی نے اس کا جواب اسی عنوان سے کامریڈ کے 22 کالموں میں دیا اور تقریباً فاقہ کشی کر کے یعنی صرف تھوڑی بہت چائے پی کر۔ 22 کالم کی تصریح ذہن میں رکھیے۔

پرچہ اس کے بعد ضبط ہو گیا اور خود محمد علی چھندواڑہ (سی پی) میں نظر بند کر دیے گئے۔ ہمدرد قدرتاً بند ہو کر رہا۔

1915 کا اخیر تھا کہ میری انگریزی کتاب Psychology of Leadership لندن سے ایک مشہور پبلشر F.Fisher Unwin نے شائع کی۔ میں نے ایک نسخہ محمد علی کی خدمت میں چھندواڑہ بھیجا، جواب میں کتاب پر مفصل تنقید انگریزی میں آئی۔ کاغذ کے 12-14 صفحوں پر۔ اس میں جہاں داد تھی، میرے اُس وقت کے ملحدانہ خیالات پر گرفت بھی اچھی خاصی تھی۔ پھر تو خط و کتابت شروع ہو گئی۔ خط کا جواب دیر میں آتا، لیکن جب آتا تو خوب دلچسپ اور مفصل سارے انتظار کی تلافی ہو جاتی۔ پہلے تو ایک آدھ خط انگریزی میں آئے۔ پھر میں نے لکھا کہ اردو میں لکھیے اس پر اردو میں آنے لگے۔ اور ایک خط میں تو اپنی شاعری کی پوری تاریخ ہی لکھ دی۔ افسوس ہے کہ اب یہ ذخیرہ میرے پاس محفوظ نہ رہا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے کہ جواہر لال نہرو میوزیم (دہلی) والے میرے پاس آئے اور جواہر لال اور گاندھی جی کے جو دو ایک خط میرے پاس محفوظ تھے انہی کے ساتھ محمد علی کے خطوط بھی اصرار شدید کر کے لے گئے! یہ دلیل اُن کی لاجواب تھی کہ آپ اتنی

حفاظت کیسے کرسکیں گے، جیسی ہمارا میوزیم کرے گا۔

شاید 1917 تھا کہ محمد علی، شوکت علی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے چھندواڑہ سے اجازت خصوصی لے کر لکھنؤ کے راستے سے اپنے وطن رام پور گئے۔ میں ایسا موقع کیوں چھوڑتا لکھنؤ میں تو اس وقت تک رہتا ہی تھا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر ''زندہ باد'' کے نعرے لگنے شروع ہی ہوئے تھے، کہ محمد علی نے یہ روک کر ایک خوش الحان قاری سے سورۂ یوسف کے رکوع یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَ اَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ الخ کے سنانے کی فرمائش کردی۔ بس پھر کیا تھا، سماں بندھ گیا۔ پنجاب میل پر انگریز بہت سے سوار تھے، سب دنگ اور مبہوت۔ جب واپسی ہوئی تو میں لکھنؤ سے ٹکٹ لے کر رائے بریلی تک ساتھ گیا۔ محمد علی نے پہلے تو خوب ڈانٹا پھٹکارا کہ میرے ''حافظ'' یا نیم حافظِ قرآن ہونے پر تو خطوں میں طنز و تشنیع کرتے رہتے ہو۔ اس وقت میں انگریزیت میں غرق تھا۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ گویا حرز جان رہتا تھا، اس کا مستقل خریدار تھا، اس کا تازہ نمبر ہاتھ میں تھا، محمد علی کا جوش تبلیغ اتنا تھا کہ بے اختیار اُبلا پڑتا تھا، کسی کے روکے نہ رک سکتا۔ کبھی فرماتے کہ رہائی پاتے ہی یورپ کا قصد ہے، تبلیغ ہی کی غرض سے۔ اقبال کی فارسی مثنویوں کے گویا حافظ ہو گئے تھے اور قرآن مجید کے بعد اسرار خودی اور رموز بے خودی کی شاید سب سے زیادہ تلاوت کرتے۔

چھندواڑہ کی نظر بندی کے بعد کچھ مدّت بیتول جیل میں گزاری۔ جب رہائی ہوئی تو کانگریس کے کام میں جُت گئے اور گاندھی جی کے نائب کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہو گئے۔ نعرۂ ''اللہ اکبر'' کے علاوہ دو ہی رہ گئے تھے ایک ''مہاتما گاندھی کی جے'' دوسرا ''محمد علی شوکت علی کی جے''۔ لکھنؤ دوبار آنا ہوا، ایک بار گاندھی جی کے ساتھ۔ قیام دونوں بار فرنگی محل میں ہوا۔ گاندھی جی کے ساتھ جب آئے تو بجائے ان کی ہمسری کے اپنی حیثیت محض ان کے نقیب کی رکھی۔ اسی الٹ پھیر میں دینی درس گاہ نظامیہ سے مولانا عبدالباری کی جانب سے ''مولانا'' کی اعزازی سند بھی مل گئی اور ان کی دوبارہ گرفتاری کا زمانہ آ گیا۔ غالباً 1921 تھا اور اب کی کراچی میں ایک تقریر کی بنا پر کہا یہ تھا کہ انگریزی نوکری حرام ہے، خصوصاً فوج میں بھرتی، گرفتاری ریل پر سفر کرتے ہوئے ہوئی غالباً والیٹر اسٹیشن پر، علاقہ مدراس میں اور مقدمہ بڑا معرکۃ الآرا رہا، بالآخر سزا دو سال کی جیل کی ہوئی۔ ادھر اُن کا جیل جانا تھا کہ اُدھر ان کے نام کا سکہ سارے ملک میں چلنے لگا۔ کیا شہر اور کیا دیہات ہر طرف اُن کی جے پکاری جانے لگی اور لکھنؤ میں دو نظمیں تو ایک

ایک کی زبان پر چڑھ گئیں، ایک کا مصرع تھا۔ ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' دوسرے کا تھا'' ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو'' اور اگر پہلی نظم کسی خوش آواز نے زہر عشق کی درد انگیز دھن میں پڑھ دی تو سننے والا تو بے اختیار ہی ہو جاتا اور سنانے والے کی کہنا چاہیے کہ ہچکی بندھ جاتی۔

محمد علی کو غزل گوئی خصوصاً نعت گوئی کا موقع پہلی دفعہ کی نظر بندی (چھندواڑے) میں اچھا خاصا مل گیا تھا۔ ان کی مشہور ترین غزلیں اسی زمانے کی ہیں۔ قوالوں (خصوصاً بانسہ، بڑے گاؤں، دریاباد کے قوالوں) نے بھی ان کو خوب چمکایا۔ کلام جوہر کے ایڈیشن بار بار نکلے اور اس خاکسار کے ایک مقدمے کے ساتھ۔ دریاباد کے قوالوں نے کلام جوہر ایک بار عُرس اجمیر کے موقع پر گاندھی جی کو سنایا اور ڈاکٹر سید محمود انگریزی میں ترجمانی کرتے رہے۔ 1922 میں جب وہ دوبارہ چھوٹے اور اپنی لڑکی کی شدید علالت کو سن کر بھوالی (پہاڑ) گئے۔ میں وہیں جا کر ملا۔ اور پھر اُن کی آمد و رفت لکھنؤ اکثر ہونے لگی۔ قیام اب مستقل دہلی میں تھا۔ اور کامریڈ اور ہمدرد کے اجرائے ثانی میں ابھی کچھ دیر باقی تھی، لکھنؤ میں قیام اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحب کے ہاں ہی کرتے۔ میں اب لکھنؤ سے دریاباد منتقل ہو گیا تھا۔ مجھے اطلاع ہو جاتی تو میں دریاباد سے لکھنؤ آ کر اکثر اسٹیشن ہی پر مل جاتا اور وقت کا بیشتر حصہ انہی کے ساتھ گزارتا، آخر انھیں دہلی کی گاڑی پر رات کو بٹھا کر دریاباد واپس چلا آتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ فرنگی محل میں رات زیادہ آ چکی تھی، مولانا سونے کے لیے لیٹ چکے تھے، لیٹے لیٹے مجھ سے فرمایا کہ تمھیں مہاتما جی کی عقیدت میں بڑا غلو ہو گیا، تم ان کی دینی عظمت اور روحانی کرامت کے بھی قائل ہو گئے ہو، مجھ میں یہ کچھ بھی نہیں۔ انھیں اپنا سیاسی لیڈر مانتا ہوں اور ان کی پیروی میں آخری حد تک جانے کو تیار ہوں، ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے وہ کام کیے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا تھا۔

اب کی جو قید سے چھوٹے 1923 میں تو اللہ نے ایک اور آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ لڑکا تو کوئی تھا ہی نہیں، لڑکیاں چار تھیں ان میں منجھلی آمنہ بیچاری دق میں مبتلا تھی، الموڑہ کے قریب بھوالی میں۔ وہاں پہنچے، میں بھی ملنے وہیں گیا۔ تین دن بعد انہی کے قافلے کے ساتھ لکھنؤ واپس آیا، انھیں اپنے مرشد سے ملنے کی بھی جلدی تھی۔ سفر کی مدت کے علاوہ لکھنؤ کے قیام میں بھی ساتھ رہا۔ کسی آریہ سماجی نے پرچہ چھاپ دیا کہ یہ کیسے ہندوستانی ہیں علانیہ کہتے ہیں کہ ''ایک فاسق مسلمان بھی گاندھی جی سے بہتر ہے''۔ شام کو جلسہ امین آباد پارک میں زوروں پر ہو رہا تھا اور چودھری خلیق الزماں صدر تھے۔ ایک شخص نے وہی پرچہ بہ صورت سوال پیش کر دیا، صدر نے کہا

کہ میں مباحثے کی اجازت نہیں دیتا۔ محمد علی برجستہ بولے ''مگر میں اجازت دیتا ہوں'' اور یہ کہہ کر تقریر شروع کردی۔ مسئلے ایک نہیں دو ہیں، ایک تو توحید و رسالت کا عقیدہ ہے، جو کوئی بھی اس کا قائل ہے میں اس کو بہتر کہنے پر مجبور ہوں۔ اس کی عملی زندگی چاہے جیسی بھی ہو، مجھے بحث اس کی عملی زندگی سے نہیں، اُس کے عقیدے سے ہے۔ بہ خلاف اس کے جس کا عقیدہ یہ نہیں، اس کی عملی زندگی جتنی بہتر ہو اور کیسی ہی اعلیٰ کردار کی مالک ہو، بہر حال عقیدے کے لحاظ سے پست و حقیر ہی ہے۔ میں سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مہاتما جی کو کتنا بہتر سمجھوں، یہاں تک کہ اپنی والدہ ماجدہ، اپنے پیرومرشد سے بھی بڑھ کر، لیکن عقیدے کے اعتبار سے ہر کلمہ گو اُن سے بہتر ہے۔ کیا مالوی جی کا یہی عقیدہ ہندومت سے متعلق نہیں؟ اگر نہیں تو وہ گویا ہندو عقیدے اور اسلامی عقیدے کو ایک درجے پر رکھ رہے ہیں اور کیوں خود مسلمان نہیں ہو جاتے؟

اسلامیت کی دُھن ایسی تھی جوان کے سارے عقلی و ذہنی کاروبار پر شدومد کے ساتھ غالب رہتی اور جرأت و ہمت اور بے باکی کے لحاظ سے تو میں نے انھیں بے نظیر پایا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے دباؤ یا مروت اور اثر میں کسی حد تک ضرور ہوتا ہے۔ مُستثنیٰ اگر پایا تو ایک محمد علی کو:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ قال نہیں حال تھا، آخر میں یہی بالکل حال بن کر رہ گیا تھا۔ آج اس سے مخالفت، کل اُس سے، اپنے ہی سکھائے پڑھائے ہوؤں کی طرف سے بیگانگی، بڑے بڑے مخلصوں اور پرانے دوستوں سے علیٰحدگی، بیماریوں پر بیماریاں، جسمانی معذوریوں پر معذوریاں مستزاد!

اکتوبر 1924 سے کامریڈ اور ہمدرد دونوں کا اجرائے ثانی کردیا تھا۔ کامریڈ کو تو غلام حسین مرحوم کے بعد کوئی قابلِ اعتماد اسسٹنٹ ایڈیٹر نہ مل سکا البتہ ہمدرد کو سید محمد جعفری جامعی وغیرہ ہاتھ آگئے تھے۔ دونوں پرچے چلے تو خوب، لیکن کوئی اچھا منیجر نہ ہاتھ آیا اور خود مولانا پر لیڈری کے سلسلے میں کام کا بوجھ بے حد پڑ گیا تھا۔ بڑے ان تھک کام کرنے والے تھے، لیکن بہر حال بشر ہی تھے۔ آج یہاں جا رہے ہیں، کل وہاں ملک میں ہر طرف سے بلاوے آتے، تار سے بھی اور خطوں سے بھی، لوگ بلانے کے لیے وفد بن کر بھی پہنچتے، مخالفتیں اور بیماریاں مستزاد۔ مجبوراً دونوں پرچے بند کرنا پڑے۔ کامریڈ تو شروع 1926 ہی میں ختم ہو گیا اور اس کے بند ہونے سے مجھے ایسا ہی رنج ہوا، جیسے کسی عزیز یا دوست کی موت پر ہوتا ہے۔ ہمدرد کسی طرح گھسٹتا، گھٹتا ہوا

مارچ 1929 تک چلا۔

وسط اپریل 1928 میں ایک غیر مسلم مہاراجہ الور نے مولانا کو اپنے خرچ پر یورپ بھیجا، ذیابیطس کا علاج کرانے مولانا تو ہمدرد کو اسی وقت بند کر رہے تھے، میرے اور ظفر الملک علوی کاکوروی کے اصرار پر جاری رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ شعبۂ انتظامی کے نگران کار علوی صاحب رہے اور شعبۂ ادارت کا میں۔ میرا نام اُس وقت بہ طور نگراں ہمدرد کے ہر پرچے پر نکلنے لگا۔ قرآنی اقتباس پر تشریحی ترجمہ کی عبارت ہر روز دیتا ہی، اداریہ بھی وقتاً فوقتاً لکھ دیتا، کبھی کبھی کتابوں پر تبصرہ بھی۔ مارچ 1929 میں حج کو گیا ہوا تھا کہ جبھی مولانا نے سفر یورپ سے واپسی پر عاجز آکر پرچہ بند کر دیا۔ میں مدینے میں تھا، جب خبر ہوئی دل کو بڑا ہی رنج و صدمہ ہوا۔

بصارت میں بہت ہی فرق آگیا تھا اور ذیابیطس کی پیچیدگی نے طرح طرح کی شکایتیں اور پیدا کر رکھی تھیں۔ آخر جب نیک دل و شریف طینت وائسرائے لارڈ اردون کی دعوت پا کر دہلی سے شملہ جا کر وائسرائے کے ڈاکٹر سے علاج شروع کرایا۔ مولانا کو اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال میں کیبن سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا، کہ ایک انگریز خاتون نے ترس کھا کر سوال کر دیا کہ ان بڑے میاں (مولانا کا اصل سن اُس وقت کل 50-51 سال کا تھا، لیکن صورتاً 70 سے اوپر معلوم دیتا تھا) کو کیا بیماری ہے؟ تو ساتھ کے ڈاکٹر نے کہا کہ یہ نہ پوچھو، پوچھو کون سی بیماری انھیں نہیں ہے۔

اس مجموعہ امراض یا زندہ جنازے کو جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اخیر 1929 میں لد پھند کر جب بھائی اور بیوی کے ساتھ لندن جانا پڑا تو اس وقت بھی اس شیر دل کے منہ سے یہی نکلا کہ ''افضل الجہاد یعنی سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی سعادت حاصل کروں''۔ بمبئی سے جب جہاز پر سوار کرائے جا رہے تھے تو ایک مخلص اور وقت کے مشہور خطیب مولانا عبدالماجد بدایونی نے پوچھا، کہ آخر اس حال میں آپ کیوں جا رہے ہیں؟ جواب برجستہ دیا کہ ''مرنے کو''۔ زندگی کی آخری سانس تک اس مردِ مجاہد نے یہ فرض پورا کیا بھی، علی گڑھ اور آکسفورڈ دونوں کی تعلیم و تربیت سے انھوں نے پورا فائدہ حاصل کیا تھا اور مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی آنریری ڈگری ''مولانا'' سے بھی۔ دینی مسائل پر اُن کی نظر اچھی خاصی وسیع بھی تھی اور گہری بھی کسی عام مولوی سے کم نہیں اور ان کی انگریزی قابلیت کا تو کہنا ہی کیا۔ اردو کا بھی ادبی و شعری مذاق حیرت انگیز حد تک اعلیٰ تھا۔ ذہانت، فطانت، خوش فکری، خوش تحریری، خوش تقریری، تاریخ عالم، تاریخ اسلام کسی میں ان کا قدم شاید کسی معاصر سے پیچھے نہ تھا اور بذلہ سنجی و حاضر جوابی کے تو گویا بادشاہ

تھے۔ عشقِ رسولؐ، عشقِ اسلام، عشقِ قرآن میں اپنی نظیر آپ تھے۔

1926 میں مؤتمر اسلامی (مکہ معظمہ) میں جب سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف تقریر کرنے انہی کے سامنے کھڑے ہوئے تو کہا:

''لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں کہ سلطان کی مخالفت شاہی آداب کے منافی ہے اور انتہائی خطرناک، میں ایسوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ جب یہ زبان وزیر اعظم برطانیہ لارڈ جارج کے سامنے کلمۂ حق سے نہ رکی، جو والی نجد وحجاز سے کہیں زیادہ طاقت رکھتا تھا، تو پھر یہاں تو ایک مسلمان کے سامنے حرم میں کھڑا ہوا ہوں، جہاں جانوروں کا بھی شکار نہیں کیا جا سکتا''۔

شریفی سعودی فتنہ ہندوستان میں مدت سے قائم تھا۔ اخیر 1925 یا شروع 1926 ہوگا کہ سیتا پور میں ان کے دوران تقریر کسی نے اعتراض کر دیا کہ ''مسئلہ حجاز میں آپ خود اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خلاف جا رہے ہیں۔ آپ سلطان ابن سعود کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ کے مرشد ان کی مخالفت''؟ محمد علی نے جواب دیا:

''میں نے مرشد کا دامن فنافی الشیخ ہونے کے لیے نہیں، فنافی اللہ کی خاطر پکڑا تھا۔ جس معاملے میں میں گمراہی پر ہوں، صحیح راستہ بتانا اُن کا حق ہے اور میرا فرض اس کو قبول کرنا۔ لیکن جس معاملے میں میں بصیرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہاں اسی طرح میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں انھیں سیدھی راہ دکھاؤں''۔ حق گوئی کی یہ مثالیں اب ڈھونڈے سے بھی ملنا مشکل ہیں۔ بڑے زندہ دل ہنسنے ہنسانے والے تھے۔ لیکن اس سے بھی شاید بڑھ کر رقیق القلب رونے رلانے والے بھی! اخیر عمر میں ذیابیطس کے مریض ہو کر پیشاب کے لیے رات میں بار بار اُٹھتے، اسی لیے فجر کی نماز مشکل سے مل پاتی۔ وقت تھوڑا بہت باقی ہوتا، لیکن بجائے جلدی کرنے کے، یہ پورے اطمینان سے غُسل کرتے اور نماز قضا پڑھتے لیکن قرأت قرآن پورے اثر کے ساتھ کرتے اور بعض وقت نماز میں رو پڑتے، تلاوت قرآن کے وقت بھی اسی خشوع اور اسی انابت کی تصویر بنے ہوتے۔ خصوصاً ان آیتوں کی تلاوت جن میں منافقین پر وعید و تہدید ہوتی۔

دل میں جائز حوصلے اور ولولے دنیاداروں کے سے رکھتے، لیکن خدا معلوم کیسے تقریباً ہر موقع پر دل مار کر رہنا پڑتا۔ ماں بڑی عابدہ تہجد گزار ملی تھیں۔ کم سنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں، مذہبی

تربیت انہی نے لڑکوں کو دی تھی۔ جب دونوں بھائیوں کو چھندواڑے میں نظر بندی کو عرصہ ہو چکا تھا تو خبر یہ مشہور ہوئی کہ گورنمنٹ کسی ذی اثر ذریعے سے ایک مسودہ معافی نامے کا ان کے پاس چھندواڑہ بھیجنے والی ہے، اس پر دستخط کر دینے سے دونوں کو رہائی مل جائے گی۔ بی اماں کو جب خبر پہنچی تو لڑکوں کے پاس کہلا بھیجا کہ ''اگر کسی بھی معافی نامے پر دستخط کا تم لوگوں نے ارادہ کیا تو قبل اس کے کہ دستخط کر سکو، اپنے انہی بوڑھے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی''۔ ان شیر دل ماں کی اولاد اگر شیر دل نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی!

محمد علی نے آخری تقریر میں اپنے زار و نزار ہونے کے باوجود کہہ دیا تھا کہ:

''اگر میرے ملک کو آزادی نہ دی تو میرے لیے یہاں قبر کی زمین دینا ہوگی''۔

بے شک قبر کے لیے زمین ملی، مگر کسی دارالکفر میں نہیں بلکہ فلسطین کے مفتی امین الحسینی کی درخواست پر بیت المقدس میں! مسجد عمرؓ کے پائیں میں اور اقبال کو سوجھ گئی کہ یہ مصرع کہہ ڈالا:

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت!

ماتم گسار ملت کی زباں پر یہ شعر آتا رہتا ہے:

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی جو مسیح
باز پس رفتی کس قدرے نشناخت دریغ

گاندھی جی (متوفی 1948)

1920 کا کوئی مہینہ تھا اور ''گاندھی جی'' کے عین شباب شہرت کا زمانہ، کہ وہ صبح سویرے کی گاڑی سے لکھنؤ پہنچے۔ تحریک خلافت و ترک موالات کی پر زور بھیڑ تھی، اسٹیشن پر میرے بالکل قریب سے گزرے۔ آنکھیں نیچی، چہرہ پر سکون، بشرے پر ریاضتوں کا غازہ، اُس وقت کرتا اور ٹوپی جز و لباس تھے۔ تصویر بار بار کی دیکھی ہوئی تھی اور نام تو بے شمار بار کانوں میں پڑ چکا تھا۔ دیکھا تو نقشہ ویسا ہی پُر اثر پایا، جیسا سُنا تھا اور تصویروں میں پایا تھا بلکہ اُس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ محمد علی ہمراہ بطور ایک مساوی لیڈر کے نہیں محض نقیب بنے ہوئے، چاکری کرتے ہوئے، موٹر کی سواری اس وقت تک اتنی عام نہیں ہوئی تھی، جوڑی گاڑی نے فرنگی محل کی سرا تک پہنچایا۔ محمد علی کوچ بکس پر بیٹھے رہے۔ رئیسوں اور لیڈروں کی بھیڑ بھاڑ چھوڑ ''مہاتما''، ''مولانا'' کے ہاں فروکش ہوئے۔ مولانا عبدالباری کے ہاں، جو سیاسی لیڈروں کی صف اول میں اس وقت تک آ چکے تھے۔

ادھر سے میزبانی اور اُدھر سے مہمانی خوب دیکھ لی۔ گاندھی جی کی غذا اس وقت تک بکری کا دودھ اور کشمش وغیرہ، بعض خشک اور تر پھل تھے۔ ایک اچھی دودھاری بکری اور وافر تعداد میں ان پھلوں کا انتظام لوازم مہمان داری میں تھا۔ مارچ 1922 میں دوبارہ گاندھی جی کے درشن اجمیر میں ہوئے۔ عرس سالانہ کے موقع پر مولانائے فرنگی محلی کی پارٹی عرس میں شرکت کے لیے لکھنؤ سے روانہ ہوئی، اس پارٹی کا ایک ضمیمہ میں بھی تھا۔ محمد علی جیل میں تھے، درگاہ میں رات کی قوالی کے وقت گاندھی جی کے سامنے مولانا محمد علی کی غزلیں گوائی گئیں۔ میں زندگی کے اس عبوری دور میں بزرگان چشتیہ کا نہایت معتقد اور قوالی سننے والا تھا۔ اپنے دریابادی قوال میاں افضل کی چوکی کو ساتھ لیتا گیا، انہی سے قوالی کرائی۔ مسلم نیشنلسٹ لیڈر ڈاکٹر محمود پاس ہی بیٹھے غزلوں کا انگریزی ترجمہ گاندھی جی کو سمجھاتے جاتے تھے۔ اجمیر ہی میں ایک دن موقع ذرا تنہائی کا مل گیا، اور میں نے ایک مختصر اخباری بیان گاندھی جی سے لے ڈالا۔ بیان سیاسی نہیں، مذہبی و اعتقادی رنگ کا تھا (سیاسی بیان تو مہاتما جی کے ہر روز چھپتے ہی رہتے تھے) گاندھی جی کا مذہبی مطالعہ بدستور جاری تھا۔ اور راڈ دول کا انگریزی ترجمہ وقرآن گاندھی جی کے ساتھ سفر میں بھی رہتا تھا، گفتگو انگریزی میں تھی۔

پہلا سوال یہ عرض کیا کہ آپ کا خدا سے متعلق کیا خیال ہے؟ عام ہندوؤں کی طرح بہت سے اوتاروں کے قائل ہوں گے؟

بولے: جی نہیں، میں کامل توحید کا قائل ہوں۔

"I PERFECTLY BELIEVE IN THE UNITY OF GOD" پھر سوال ہوا، ''اور ہمارے رسولؐ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟''

بولے ''میں انھیں دنیا کا مُعلّم سمجھتا ہوں''۔

I BELIEVE HIM TO BE A WORLD TEACHER

میں نے کہا کہ ''اُس مُعلّم یا ہادی کو ہم لوگ اپنی اصطلاح میں پیمبر کہتے ہیں''۔

اس پر خاموش رہے اور کچھ زبان سے جواب نہ دیا۔ سکوت سے اشارتاً اثبات یا تائید نکل سکتی ہے۔ اپنا خیال ہے کہ گاندھی جی توحید کی حد تک تو مسلمان تھے اور خدائے واحد ہی کو خالق، کارساز اور حکمراں سمجھتے تھے۔ اصل اشتباہ و مغالطہ انھیں مسئلۂ وحی میں رہا۔ آریائی نسل کے عام طرز تخیل و تفکر میں انھیں ٹھوکر اسی مسئلۂ وحی و رسالت ہی میں لگی۔ اوتار یا حلول کا عقیدہ تو ان کی سمجھ

میں آ ہی گیا ہے۔ یعنی یہ کہ خالق کسی مخلوق کا قالب اختیار کر کے دنیا میں آ گیا، لیکن رسالت سمجھ میں نہیں آئی۔ یعنی یہ کہ خدا کسی بندۂ خاص کو اپنا پیام رساں بنا کر بھیجتا ہے اور سارا کلام و پیام بندوں سے اُسی کے ذریعہ وواسطے سے کرتا ہے، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

رسول اور نبی ان کے نزدیک بڑے انسان ہوا کرتے تھے، نہایت درجہ قابل احترام، مصلح و محسن انسانیت ہو کر آتے تھے۔ گاندھی جی مسلمانوں کے مخلص، بہی خواہ، ہم درد تھے، ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہندو اسے برداشت ہی نہ کر سکے کہ مہاتما جی 55 کروڑ کی رقم چُپ چپاتے ہندوستان سے پاکستان کو دلا دیں اور اسی طرح اس اکثریت نے اسے بھی معاف نہ کیا کہ گاندھی جی مسلمانوں کے ایک خالص مذہبی مسئلہ خلافت میں تمام تر مسلمانوں کے ہم زبان اور ترجمان بن جائیں اور برطانیہ سے خواہ مخواہ اس معاملہ میں ٹکر لیں۔

تیسری بار ایک بار پھر گاندھی جی سے یکجائی ہوئی۔ اکتوبر 1924 کو جب گاندھی جی نے دہلی میں مولانا محمد علی کے مکان پر مقیم ہو کر 21 دن کا برت رکھا، ہندو مسلم اتحاد کے لیے، تو اتفاق سے اس زمانے میں میں بھی مولانا محمد علی کا مہمان تھا اور یکجائی دو چار دن تک رہی، اس ہنگامہ خیز 21 روز برت کا پس منظر و پیش منظر پوری طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گاندھی جی کی زندگی کے بعض پہلو بڑے قابل رشک تھے، ہر حال اور ہر موسم میں اُن کا صبح چار بجے اُٹھ پڑنا، اُسی وقت اُن کا ٹھنڈے پانی سے غسل، اُن کی صبح کی عادت اور سارے کھانے پینے، پڑھنے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے کے معمولات منٹ منٹ کی پابندی سے پورے ہونا، ان کی سادگی اور حیرت انگیز قناعت، بے طمعی اور بے نفسی، غصّے پر قابو، کسی حال میں مشتعل نہ ہونا، غریب پروری، سچائی کا دامن اپنے امکان بھر برابر پکڑے رہنا، جفاکشی، اسی طرح کی بیسیوں چیزیں اُن میں قابل رشک تھیں اور اُن سے لینے کے قابل۔ اگر اسلام کے اور نمونے اس سے بھی بہتر انھیں مل جاتے اور ایک عرصے تک ملتے رہتے تو عجب نہیں کہ وہ اسلام سے اور زیادہ قریب آ جاتے اور اسلام سے ان کی اجنبیت تمام تر رفع ہو جاتی۔ قرآن کے ترجمے جو بہتر سے بہتر ہوئے ہیں، وہ بھی قرآن کا بدل کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتے۔ وہ اثر اندازی میں اصل قرآن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ چہ جائیکہ وہ انگریزی ترجمے جو انگریزوں کے کیے ہوئے تھے اور جن تک گاندھی جی کی رسائی محدود تھی!۔

رہی تاریخِ اُمت تو وہ خلافت راشدہ کے دَورِ صدیقی و دورِ فاروقی کو چھوڑ کر مسلمانوں ہی کے لیے کیا تبلیغی اہمیت و کشش رکھتی ہے، جو ایک پیدائشی غیر مسلم کے لیے رکھتی!

پاکستان قائم ہونے کے بعد وہ ایک عظیم منصوبہ مغربی پاکستان جانے کا بنا چکے تھے کہ اپنے دو چار ہندو مخلصوں، رفیقوں اور شریک کاروں کو لے کر سیکڑوں اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کر کے جائیں گے۔ اِدھر سے وہاں کے بھاگے ہوئے ہندوؤں کو ساتھ لے جاکر دوبارہ پھر آباد کرتے، اور اُدھر سے ہراس زدہ و دہشت زدہ ہندوستانی مسلمانوں کو لے کر واپس آئیں گے۔ آہ کہ نوشتۂ تقدیر کچھ اور ہی تھا!

جواہر لال نہرو: 1889 تا 1964

پنڈت جی کے مذہبی عقیدوں سے یہاں بحث نہیں ان کی لادینی آشکارا تھی۔ یہاں ذکر اُن کی بلند کرداری اور شرافتِ نفس کا کرنا ہے۔ وہ ایک بڑے شریف و کریم باپ کے بڑے شریف و کریم فرزند تھے، تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ پائی۔ پرورش بڑے ہی خوشحال اور انتہائی ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی۔ آزادیاں ہر قسم کی۔ کیا ہندوستان اور کیا انگلستان ہر جگہ میسر رہیں۔ بے فکری سے جس طرح چاہتے خوب پیتے پلاتے، یار آشناؤں کے ساتھ چھرّے اڑاتے، ہر طرح دادِ عیش دیتے یہ کچھ نہ ہوا شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں برق، علمی بلندیوں کے شیدا، ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع ہی سے اپنا مقصودِ زندگی بنالیا اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا نہ مال و جاہ کی محبّت کو سینے میں جگہ دی، نہ اپنے کو بڑا مانا نہ کسی پر اپنا تفوّق جتایا۔ خدمت لینے کی نہیں خدمت کرنے کی دُھن سوار رہی۔ دنیا نے خادم کی جگہ اُنھیں مخدوم بنا دیا اور اپنے سر اور آنکھوں پر جگہ دینا شروع کردی۔ جوانی میں بڑی سختیاں جھیلیں۔ خدا معلوم جیل ہی میں کتنی مدّت کاٹی۔ دوستوں کی بے وفائی، طوطا چشمی، غدّاری کے شکار آخر تک رہے۔ اپنوں ہی کے تیر پر تیر کھاتے رہے۔ صحت جو آخر میں اتنی گر گئی تھی اس میں سن شیخوخت سے کہیں زیادہ دخل ان مسلسل دل شکنیوں اور شدید مایوسیوں کو تھا۔

مسلمانوں سے ہمیشہ خوب بنی۔ پوشاک، کھانے، پینے، بول چال، عام طرزِ معاشرت و تمدّن میں دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب و تمدّن کو بالکل اپنائے ہوئے تھے اور اپنے والد پنڈت موتی لال کے قدم بہ قدم تھے، رفیقوں، دوستوں، مخلصوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر سیّد محمود، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری،

عبدالمجید خواجہ، چودھری خلیق الزّماں، تصدّق احمد خاں شیروانی سے گہرے تعلقات تھے اور رفیع احمد قدوائی تو جیسے ان کے عزیز قریب ہی تھے خدا جانے کتنے نوجوان مسلمانوں کو اپنے خرچ سے پڑھوایا، ملازمتیں دلوائیں، روزگار سے لگایا اور کتنے سن رسیدہ مسلمانوں کی اپنے پاس سے مالی امداد کی۔ جوانی کا کوئی بھی ساتھی اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد مل گیا تو اس کی آؤ بھگت اُسی پرانے طریقہ پر کی۔ یہ پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ وہ اس وقت وزیر اعظم ہند سے مل رہا ہے۔ غریبوں، مصیبت زدوں کی امداد میں ملکہ خاص تھا۔ غرض جوہر انسانیت کا ایک نمونہ تھے اور ایک ہی وقت میں مدبر بھی، مفکّر بھی، صاحبِ علم بھی۔ پرانی اردو میں ایک لفظ وضع داری آتا ہے وہ گویا اُن پر ختم تھی۔ عام مسلمانوں کے لیے اب بھی ایک بڑا سہارا بنے ہوئے تھے۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک، مزاج میں تواضع و فروتنی اتنی کہ 1924 میں جب میں نے محمد علی سے پوچھا کہ گاندھی جی کا جانشین آپ کے خیال میں کون ہوسکتا ہے؟ تو انھوں نے جھٹ سے جواہر لال نہرو کا نام اور صرف انہی کا لیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ان میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے کو پیچھے ہی بہت رکھتے ہیں۔ مولانا ہی نے اپنے صدارت کے زمانۂ کانگریس 1923 میں انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا اور دیگر طریقوں سے بھی آگے بڑھایا۔

ہندوستان کی 46 کروڑ مخلوق کے تو گویا سیاہ و سپید کے مالک تھے ہی بَرّ اعظم ایشیا بلکہ کہنا چاہیے کہ روئے زمین پر اقتدار کے حصّہ دار تھے۔ مرجع خلائق اور ناموران عالم کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ جب وقت موعود آیا تو آنے میں چند گھنٹے بھی مشکل ہی سے لگے 17 مئی کو صبح 6 بج کر 20 منٹ پر اچانک بیماری کی پہلی علامتیں معلوم ہوئیں اور ماہر فن ڈاکٹر ٹیلیفون پر طلب ہوئے اور ہر ممکن انسانی تدبیر دوا علاج کی شروع ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد بیدار مغز اور مجسم ذہانت و فطانت مریض بیہوش تھا۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر جمع ہوتے گئے۔ مریض کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ 11:30 پر حالت اور بگڑی، آکسیجن پہلے سے دیا جا رہا تھا، بلڈ پریشر گرنے لگا اور 1:30 بجے نبضیں ڈوبنے لگیں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، اٹل تقدیر کے آگے عقل، سائنس، تدبیر کی متحدہ ترقی یافتہ کوششوں کی شکست کا ایک اور اعلان۔ یہاں تک کہ دوپہر کے دو بجتے ہی مملکتِ ہند کا آفتاب اپنی ساری خیرہ کُن تابانیوں کے ساتھ غروب ہوکر رہا۔ موت جس طرح دنیا کے حقیر ترین گدائے بے نوا کو آتی ہے اسی قطعیت اور اسی برق رفتاری سے وقت کی ایک مقتدر ترین ہستی کو آکر رہی۔ ماہرینِ فن کی پوری ٹیم مل کر منٹ دو منٹ کے لیے ہوش ہی میں لے آنے میں

ناکام رہی۔

ابوالکلام (متوفی 1958)

مولانا ابوالکلام کے نام سے آشنائی اس وقت ہوئی جب 1905 میں ان کے مضمون الندوہ میں چھپنے لگے، میں شاید نویں درجے کا طالب علم تھا اور الندوہ اور اس کے ایڈیٹر مولانا شبلی سے بہت ہی متاثر اور مرعوب تھا۔ الندوہ میں کسی کا ایک آدھ مضمون چھپ جانا ہی اس کے علم وفضل پر ایک زبردست دلیل تھی چہ جائیکہ کئی کئی مضمونوں کا! ابوالکلام یقیناً کوئی مولانا شبلی ہی کے ٹکر کے ''مولانا'' ہوں گے اور اپنے کلّے ٹھلے سے ''مولانا'' معلوم بھی ہو رہے ہوں گے۔ ان کے مضمونوں کی قدرت انشائی اور بلند آہنگی تو یہی کہے دیتی تھی۔

1906 میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کا جلسۂ دستار بندی رفاہ عام کی عمارت میں ہوا، میں سیتا پور سے آکر شریک ہوا، مولوی سید سلیمان ندوی کا آخری سال تھا۔ انھوں نے اپنی برجستہ وامتحانی عربی تقریر میں کہیں کہہ دیا کہ اسلام کی لازمی شرط تو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا پڑھ دینا ہے۔ مولانا شبلی نے ٹوکا کہ ہاں پورا کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ معاً حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو داڑھی والے اور ''مُتَشَیِّن'' تھے خود مولانا شبلی کو ٹوکا کہ آپ گڑبڑاتے ہیں، لڑکا ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ حدیث میں آچکا ہے من قال لاالٰہ الاّ اللّٰہ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ دل نے کہا کہ یہ صاحب یقیناً مولانا ابوالکلام ہی ہوں گے، ان کے سوا اور کس میں اتنی ہمت ہوسکتی ہے کہ مولانا شبلی کو ٹوک دے۔ خیال تمام تر غلط نکلا، ابوالکلام اس وقت تک اس سن سال کے بھی نہ تھے اور چہرہ بالکل صاف رکھتے تھے، داڑھی اول تو تھی ہی کہاں اور بہرحال جتنی تھی بھی، اُسے رکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ حکایت سے اندازہ صرف اس کا کیجیے کہ شبلی کی طرح ابوالکلام کا بھی رعب دل پر کتنا بیٹھا ہوا تھا۔

1909 تھا کہ میں کیننگ کالج کا طالب علم تھا کہ ایک دن، دن کے وقت لکھنؤ اسٹیشن کسی کو رخصت کرنے گیا، دیکھا کہ ایک نوجوان، وجیہ، شکیل، داڑھی مونچھ صاف، سیکنڈ کلاس (آج کے فرسٹ کلاس) ویٹنگ روم سے باہر نکلا، غالباً سگریٹ مُنھ میں دبا ہوا۔ کالا تر کی کوٹ اس کے گورے رنگ پر بڑا ہی بھلا لگتا تھا اور کسی نے بتایا کہ ابوالکلام یہی ہیں۔ یقین نہ آیا، مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مُدت کے بعد ملاقات مولانا شبلی کے مکان واقع گولہ گنج میں ہوئی، ان کے ہاں آئے ہوئے تھے اور میری حاضری اکثر مولانا شبلی کے ہاں ہونے لگی تھی۔ مولانا اس وقت گولہ گنج احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی میں رہتے تھے، دارالعلوم سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر۔ مولانا نے تعارف کرایا، بے تکلفی سے انھیں صرف آزاد کہہ کر پکارتے تھے اور تعارف باقاعدہ ہوگیا۔ دارالعلوم ندوہ کچھ دن بعد اپنی نئی اور مستقل عمارت میں گومتی پار اُٹھ گیا۔ مولانا منتقل ہوکر نئے امین آباد پارک کے ایک پرفضا بالاخانہ غالباً 51 پر آگئے اور اب جب ابوالکلام کا لکھنؤ آنا ہوتا تو یہیں ٹھہرتے۔

اب مراسلت بھی اُن سے شروع ہوگئی تھی اور بظاہر اچھے خوشگوار تعلقات تھے لیکن اندرونی حالات، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور ندویوں سے جو معلوم ہوتے رہتے تھے اور جہاں ان کی ذہانت، طباعی، حاضر دماغی اور قوت حافظہ کی مدح و داد میں ہوتے رہتے تھے، وہیں ان کی دینی و اخلاقی حالت کی طرف سے کچھ اطمینان بخش نہ تھے اور غضب یہ تھا کہ خود مولانا شبلی بھی ان روایتوں کی کُھل کر تردید نہیں کرتے تھے۔ راوی یوں بھی فی الجملہ ثقہ و معتبر ہی تھے، اب گویا مُہر تصدیق لگ گئی اور اب دل میں وقعت و عظمت پیدا ہونے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

اپریل 1912 میں سید رشید رضا مصری لکھنؤ ندوہ میں بہ حیثیت صدر مجلس کے آئے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا برجستہ خطبہ عربی میں تھا۔ مولانا ابوالکلام بھی سامعین میں تھے۔ اصل تقریر کے معاً بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ایسا رواں اور فرفر کردیا کہ اوروں کے ساتھ مولانا شبلی کو بھی حیرت ہوگئی۔ جون 1912 میں محض سیاحتاً کلکتہ جانا ہوا، الہلال نکل رہا تھا اور خوب زوروں پر مولانا نے یہ اصرار اپنے ہاں اُتارا، اور بڑے اخلاص سے مہمان نوازی کرتے رہے، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا عبداللہ عمادی اور دو ایک اور بزرگ الہلال کے اسٹاف میں تھے۔ ان سب کی ملاقات و حسنِ التفات نے قیام کلکتہ کو لطف و انبساط سے بھر دیا۔ مگر ساری گفتگوئیں ادبی و علمی پہلوؤں سے رہتی تھیں۔ مذہب کا چرچا نہ دیکھا نہ سُنا اور مجھے اُس وقت کے ملحد کو فضا اس سے بہتر اور کیا ملتی۔

کچھ ہی روز بعد الہلال میں میری ایک نئی کتاب فلسفۂ جذبات کے سلسلے میں ایک علمی اصطلاح سے متعلق الہلال کے ایک اختلافی نوٹ سے، ایک ادبی بحث چھڑ گئی اور بالکل بلاوجہ اس میں تلخی پیدا ہوگئی۔ ملال دل میں پہلے سے موجود ہی تھا۔ اس گرما گرمی نے اُسے تیز سے تیز تر کردیا۔ اور ایک مخلص (مولانا عبدالباری ندوی) نے اگر مجھے خاموش ہو جانے پر مجبور نہ کر دیا ہوتا، تو خدا

معلوم نوبت کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی۔ اللہ مجھے اور فریق مقابل دونوں کو اس کے لیے معاف فرمائے۔ زیادتی اب سوچتا ہوں اور سالہا سال ہوئے کہ سوچ چکا ہوں، میری تھی۔ 1918 میں جب میں حیدرآباد میں تھا اور مولانا رانچی جیل میں تو اس رنجش کی صفائی بھی مراسلت سے میں نے کرلی اور مولانا نے بہ وجہ اخلاق کریمانہ لکھ دیا کہ کوئی کدورت یا رنجش میری طرف سے تو تھی ہی نہیں اور اس کے بعد آخر تک تعلقات معتدل و متوازن رہے۔ خلافت کمیٹی کے سلسلے میں ملاقاتیں کثرت سے رہیں۔ پہلے کانپور اور پھر بار بار دہلی میں اور لکھنؤ جب جب مولانا لیڈر ہونے کے بعد آئے اور اب مولانا شبلی کی وفات کے بعد لکھنؤ کے ایک بڑے ہوٹل (اس وقت تک سِول اینڈ ملٹری اور اب برلنگٹن) میں ٹھہرتے تھے، تو غریب خانے پر آکر بھی عزت افزائی فرماتے۔

مولانا کا مسلسل قیام لکھنؤ میں کل چھ مہینے کا رہا،1905 میں مگر اتنے دنوں کے قیام میں لکھنوی زبان کے اُن گوشوں پر بھی عبور حاصل کرلیا تھا، جو صرف سالہا سال کے قیام ہی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک باریک چیز پہلوئے ذم سے احتیاط ہے۔ اچھے اچھے اس میں غچہ کھا جاتے ہیں۔ مولانا نے اسے گرفت میں لے لیا تھا اور لکھنؤ کے بعض استاد تک ان کے سامنے زبان کھولتے ہچکچاتے تھے، مرزا عزیز لکھنوی اہل زبان تھے۔ ان کا دیوان ''گلکدہ'' جب چھپا تو مولانا نے اپنے تبصرے میں زبان کی ایک دو گرفتیں بھی کیں۔

مولانا نے علوم عربی اسلامی کی تحصیل و تکمیل با قاعدہ کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال ان کی نظر کہنا چاہیے کہ سارے ہی علوم دینی پر وسیع و محیط تھی اور دماغ مجتہدانہ لے کر آئے تھے۔ آخر عمر میں اخلاقی حیثیت سے بڑے پاکیزہ ہو گئے تھے اور عمر میں پختگی اور سنجیدگی آجانے سے شوخی و ظرافت پر قابو حاصل ہو گیا تھا۔ دوسرے کا کام نکال دینے میں ہر وقت مُستعد و آمادہ رہتے تھے۔ بڑی بات یہ کہ ہندی سرکار اور ہندو اہل حکومت سے اتنا گہرا اور ہمہ وقتی تعلق رکھنے کے باوجود اکثریت سے مرعوب ذرا نہیں ہوئے اور کسی موقع پر بھی اپنے کو مسلمان کہتے نہ شرمائے۔ لغزشیں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اللہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

جواہر لال تو ان کی سوجھ بوجھ اور عقل سیاسی کے بھی بہت قائل تھے۔

حسن تقریر میں بے مثل تھے، پہلے تقریر اور زیادہ جوشیلی ہوتی تھی اور بعض لفظ اور فقرے نا ملائم بھی زبان سے نکل جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس پر انھوں نے قابو حاصل کرلیا اور تقریر بڑی صاف شستہ، پُر مغز، مُدلل و مصالحانہ ہونے لگی تھی۔ اردو زبان کے وہ ادیب ہی نہیں، ایک

صاحب طرز انشا پرداز تھے اور جو رنگ انشاء اُن کا تھا اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ ہو سکا۔ بڑا ہی ظلم ان لوگوں نے کیا ہے، جنھوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخیں لکھی ہیں اور مولانا کو برابر نظر انداز کیا ہے۔ یہ ظلم مولانا اور اردو زبان پر ہی نہیں، خود اپنے اوپر بھی ظلم ان کے لکھنے والوں نے کیا ہے۔ پہلے تحریریں عربیت آمیز اور ثقیل ہوتی تھیں، آخر کی تحریریں بڑی سلیس اور عام فہم اردو میں ہونے لگی تھیں۔ جب مولانا کی یاد آتی ہے، بہت ہی خوشگوار یادوں کا جھرمٹ اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ ونزعنا مافی صدورھم من غلّ۔

ابوالکلام کی شخصیت

ملک کے مایہ ناز ادیب اور اپنے محترم معاصر مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو اپنے منفرد شگفتہ انداز میں مولانا مرحوم نے خراج عقیدت لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے 11 نومبر 1963 کو پیش کیا:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن، اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس خو بو کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانے میں دیکھ ہی لی اور تصویر بھی کیسی سجی سجائی نک سک سے درست نوک پلک سے آراستہ، نج کی محفلیں ہوں یا یاران بے تکلف کا مجمع، تو آپ دیکھیے مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں۔ لطیفوں پر لطیفے دینی، سیاسی، ادبی، علمی، شخصی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے۔ لطیف و شگفتہ ایک سے بڑھ کر ایک کہیں شعر سنا رہے ہیں کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے ہوئے ہیں اور طبیعت کی آمد ہے کہ بس پکار رہی ہے:

ہے زبان میری ابر گہر بار

گھنٹوں نہیں، پہروں بیٹھیے اور دل نہ گھبرائے۔ نہ اکتائے، نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حس دینی پر پڑی، تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر۔ اب سماں ہی دوسرا۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے۔ دیش ہو یا سودیس کہ دلائل کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے اور زبان ہے کہ اب پھر صدا لگائے ہے کہ:

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار!

لیکن جوش وخروش کے عالم بھی، شروع جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں۔ قابو کے اندر۔ نطق اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا۔ اشتعال کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور حلم ومتانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں!

ایک دفعہ کی بہار سنیے لیکن چشمِ تصور کے سامنے زمانہ آج سے 43 سال قبل 20 کو لے آیئے وقت تحریک خلافت وتحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا، بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پُرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لیکن یوپی ہی کا ایک معلوم ومعروف دینی مرکز اینٹی خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدود کفر میں داخل اور اس کے علم بردار دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اس شہر میں کی جائے — اچھا صاحب۔ جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوب پڑ گئی۔ مخالفین بیڑا اٹھا کر چلے کہ آج جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیا جائے اور بیڑے کو غرق ہی کر کے واپس آئیں اور عبائے خلافت کے دامن کو اپنی مقراض تکفیر سے تار تار کر کے رکھ دیں! ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو:

ہے سانپ کے منہ میں انگلی اپنی!

انجام دیکھیے کیا ہو۔ مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔

لیجیے جلسہ شروع ہو گیا، مخالفین کی طرف سے میدان خطابت کا ایک پہلوان۔ شہ زور اور اکھاڑے میں اتارا گیا۔ کشتی پر کشتی مارے ہوئے، داؤ پیچ کی استادی میں نام پائے ہوئے اور اس نے تقریر یہ مارا وہ مارا کے انداز میں شروع کر دی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری! اب یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور بہر حال جوابی تقریر کے لیے وہی کھڑے ہوئے۔ لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے لوہا نکلا۔ اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر ہلڑ گلڑ کی متوقع لیکن — لیکن — یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی۔ اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق! اور یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں، نہ تعریض نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم وتذکیر وتشریح، نہ مناظرہ نہ مفاخرہ نہ مکابرہ نہ مجادلہ! تقریر دلائل وحقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی! — حریف اب کرتا بھی تو کیا کرتا سارے ارمان پھٹ پھٹا کر رہ گئے۔ غالب کے پرزے اڑنے کی جو خبر گرم تھی۔ وہ مولانا کے علم وتدبر

کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو ہی نہ پایا!:

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا۔اس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دور والے اس دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہوگا! اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔فیض بس مبداء فیض سے پائے ہوئے۔رسماً کچھ کسی سے پڑھ پڑھا لیا ہو تو اور بات ہے، ورنہ حقیقتاً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق:

شاگرد رشید حق تعالیٰ کے بنے ہوئے!

خدنگ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا۔اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکز نظر بن گئے۔لسان الصدق کلکتہ سے نکالا، تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آ نکلے تو ایڈیٹر بنے بغیر ہی ایڈیٹر بن گئے۔جب وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا، تو اس کا نام دور دور چمکا دیا۔یہ تو سب اس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں۔جب کلی کے پھول بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب کے ساتھ نکالا، تو:

چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ نام کا الہلال چند ہی روز میں ماہ دو ہفتہ یا بدر کامل تھا، انگلیاں ہر طرف سے اٹھنے لگیں اور مرحبا اور خوش آمدید کے پھول ہر شہر اور ہر قریہ سے برسنے لگے۔

تقریر و تحریر کی جامعیت جیسی اس بھرپور شخصیت کے حصہ میں آئی، کمتر ہی کسی کے نصیب میں آئی، خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے۔اردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کر دیا۔صبح زندگی سے لے کر شام حیات تک، سیکڑوں نہیں ہزاروں تقریریں کر ڈالیں۔ ہر تقریر انتخاب، بلکہ اپنی جگہ لاجواب مخالفین کے مجمع میں یہ جوہر اور زیادہ چمکتا اور ان کے ہوائی قلعوں کو دم کے دم میں بٹھا دیتا۔جواب کے لیے چلا ہو لفظ ہمارے عوام کیا، خواص کی زبان پر بھی ''دنداں شکن'' ہے۔ لیکن ابوالکلام کی تقریر نے نہ کسی کا دانت توڑا نہ جبڑا۔کانوں کی راہ سے سیدھی دل میں اترتی اور

وہیں اپنی جگہ بنالیتی۔

تحریروانشاء میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھااور کتاب تذکرہ میں توثقیل سے گزر کر اثقل ہوگیا ہے۔لیکن جاذبیت نے رفاقت اس حال میں بھی نہ چھوڑی۔رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہوگیا۔غبار خاطر و کاروان خیال شگفتہ بیانی کے ماڈل یا مجسم نمونے ہیں۔دین کی خدمت علمی رنگ میں اپنی تفسیر کے ذریعہ بھی کی اور متعدد فقہی رسالے جو اپنی یادگار چھوڑ گئے،وہ اس کے علاوہ۔ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا۔ہزار ہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی۔اُن کی انفرادیت کی،ان کے قلم کے بانکپن کی،ان کی خدمت تخلیق کی زبان کے باب میں کیا ملکہ لے کر آئے تھے!لکھنؤ میں مستقل قیام زیادہ لمبانہیں رہا تھا۔چند مہینے ہی تو شاید رہے تھے۔لیکن زبان لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کرلیا،کہ جیسے سدا کے لکھنوی ہوں!

سیاسیات کے کوچے میں قدم رکھا،تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے اپنا لوہا منوالیا اور گاندھی جی اور جواہر لال تو جیسے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے۔کلمہ ان کی پرجوش خطابت کا نہیں۔کلمہ ان کی فہم وفراست کا۔دانش وبینش کا۔ دوربینی اور تدبر کا۔کسی دوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں الٹے اپنی ہی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کرتے رہے۔نظریاتی اختلاف کیا دینی اور کیا سیاسی،اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا،وہ ہونا بالکل قدرتی تھا۔لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں تبدیل ہونے دیا۔حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا اس کی لپیٹ میں آکر قریب تھا کہ عربی زبان اور اسلامی علوم کا نادرونامور ادارہ دائرۃ المعارف گردش روزگار کی نذر ہوجائے۔عین وقت پر ابوالکلام کی شخصیت آڑے آئی اور اس نے اس بین الاقوامی ادارہ کو قائم ومحفوظ رکھ کر بھارت کے سیکولرزم کا بھرم قائم رکھا اور اپنے ملک و وطن کی نیک نامی پر آنچ نہ آنے دی۔

رفیع احمد قدوائی مرحوم

آنریبل احمد قدوائی وزیر خوراک مملکت ہند کی وفات پر تعزیت کی جائے؟ کون ہے جو دل

سے ان کا سوگوار نہیں؟ کون ہے جس کی وہ بالواسطہ سہی، کوئی نہ کوئی خدمت نہیں کر گئے۔1894 میں مسولی ضلع بارہ بنکی کی خاک سے اٹھے۔1954 میں ناسوتی زندگی کے 60 سال گزار کر اسی خاک میں پہنچے۔خدمتِ خلق کو بہ طور مقصد حیات یا مشن کے اختیار کر کے ایک عالم میں اپنا نام کر گئے۔

قدوائی خاندان اودھ کا ایک مشہور خاندان ہے۔ہر علم وفن ہر شعبۂ زندگی میں آج سے نہیں کئی صدیوں سے ممتاز، خود رفیع مرحوم کے حقیقی چچا جوان مرگ ولایت علی ''بمبوق'' (متوفی 1918) انگریزی کے ایک بہترین انشا پرداز اور مولانا محمد علیؒ کے مخلص خصوصی حال ہی میں گزر چکے ہیں۔رفیع مرحوم بعض حیثیتوں سے ان سب سے بازی لے گئے۔

علی گڑھ میں تعلیم پائی، تربیت خصوصاً سیاسی تربیت موتی لال نہرو کے سایۂ عاطفت اور جواہر لال نہرو کی رفاقت میں ملی۔نظم وتنظیم کی بے مثل صلاحیت فطری تھی۔علی گڑھ میں اس کی نشوونما ہوئی۔دردِ ملّت علی گڑھ سے لیا۔سیاسی سوجھ بوجھ کے لیے آنند بھون کے در ودیوار کافی تھے۔اپنے کو پیچھے ہی رکھنا جانتے تھے اپنے کو آگے بڑھانے کے فن سے ناواقف تھے مگر بڑھائے گئے، کھینچ کر اور دھکیل کر آگے بڑھائے گئے۔کونسل کے ممبر ہوئے پھر اپنے صوبہ میں پہلے ریونیو اور پھر ہوم منسٹر ہوئے لیکن اُن کی ہوم منسٹری کے عدل وقسط، دادرسی اور حق کوشی کو ہندوؤں کی متعصب پارٹی برداشت نہ کر سکی۔ہٹائے گئے، ہٹ کر اور اونچے ہوئے۔صوبائی وزیر کے بجائے حکومت ہند کے وزیر ہوئے۔محکمۂ ڈاک وتار کے اور اس میں نام پیدا کر کے رہے۔پھر دشوار ترین محکمۂ غذا میں منتقل ہو گئے، سالہا سال کی گرانی کو انھوں نے مٹایا۔راشن کو انھوں نے توڑا اور جس محکمہ کو سنبھالنے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، جیرام داس دولت رام اور گورنر کے۔ایم منشی جیسے خواص تک سب عاجز وناکام رہ چکے تھے اس میں کامیابی نے قدم انھی کے چومے اور جو بدنامی یقینی سمجھی جاتی تھی اس کے بدلے نیک نامی کا تاج انھی کے سر کو نصیب ہوا۔

کہتے کم تھے کرتے زیادہ تھے۔کتابوں کا مطالعہ برائے نام سا تھا مصداق فی الحقیقت "خود توئی امّ الکتاب" کے ساتھ اپنی فطری ذہانت، ہوش مندی، فہم سلیم کی مدد سے باتیں اپنے دماغ سے نکالتے تھے۔تقلید جامد کے قائل نہ تھے۔تقریر کے شوقین اور تقریر باز نہ تھے۔ضرورت کے وقت تقریر کرتے بھی مختصر اور حشو وزوائد اور خطابیات سے پاک سرتاپا باعمل تھے اور ہر وقت عملی سرگرمی میں منہمک، اس کے باوجود خشک یا عبوس ذرا سا بھی نہ تھے ہر وقت خوش رہتے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔بہت سویرے اٹھتے اور اسی وقت سے ان کا کام

شروع ہو جاتا۔ دنوں کے کام گھنٹوں اور گھنٹوں کے کام منٹوں میں چکا دیتے۔ کھڑے ہو کر اور ٹہلتے ہوئے یا لیٹے ہوئے ہر حال اور وضع میں کام ہی کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ غالباً جانتے ہی نہ تھے کہ کوئی چیز بے شغلی بھی ہوتی ہے۔ ہندو سیاسی کارکنوں، مدبّروں، اہل سیاست کے مقابلہ میں ان کے درمیان میں کھڑے رہ کر اپنے حسنِ عمل، قابلیت، حسنِ انتظام، کارگزاری، تدبّر اور تدیّن سے مسلمانوں کا بول بالا کر دیا۔ تنہا یہی ایک خدمت قدوائی مرحوم کو امتیاز اور بڑے امتیاز کے مقام پر کھڑا کر دینے کو کافی ہے۔

دشمنوں سے اس طرح ملتے کہ جیسے دوستوں سے ملا جاتا ہے۔ دوستوں سے یوں برتاؤ کرتے کہ جیسے عزیزوں اور قریبوں سے کیا جاتا ہے اور عزیزوں اور قریبوں کو اپنے نفس کی طرح عزیز رکھتے۔ بلکہ شاید اس سے بھی مقدم اور یہ دوست و دشمن اپنے اور غیر کی تفریق بھی کیسی، کوئی ان سے کام نکالنا چاہے یا کسی کو ان سے کوئی ضرورت آپڑے تو انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کون اپنا ہے اور بے گانہ کون؟ مقصود انھیں صرف کام کر دینا ہوتا تھا اور اس وقت ہر ایک ان کا ہوتا تھا بے گانہ کوئی بھی نہ رہتا خلق اللہ کی خدمت وہ عبادت کی طرح کرتے تھے اور خدمت کرنے میں انھیں وہی مزہ آتا تھا جو دوسروں کو خدمت لینے میں آتا ہے۔

جوانی آزادانہ گزری لیکن عمر کے کسی دور میں نہ نائے نوش کے قریب گئے نہ ان شغلوں میں پڑے جو لازمۂ شباب سمجھ لیے گئے۔ مشرقی اخلاق و ادب کی پوری پابندی کے ساتھ شباب اور شیب کی ہر منزل گزار دی۔ شادی خاندان ہی میں ہوئی اور بیوی نیک دل، دیندار، عبادت گزار ملیں نہ انھیں کبھی پردے سے باہر نکالا نہ انھیں کسی طرح آزاد محفلوں میں شریک کیا۔ بلکہ ان کی دینداری میں ہر طرح معین ہی رہے۔ پچھلے سال انھیں حج بھی کرا دیا۔ جس اُونچے حلقے میں وہ تھے وہاں اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

زندگی تمام تر سادہ ہی رہی۔ وہی موٹے کپڑے کی معمولی شیروانی اور پائجامہ، سوٹ، ہیٹ کو چھوا ہی نہیں۔ کپڑے کسی اونچے ٹیلر ماسٹر کی دوکان سے نہیں گھر سے سل کر آتے، سرکاری کوٹھی اور اس فرنیچر جیسا بھی شاندار ہو ان کے گھر کو جا کر دیکھیں تو حیرت ہو جائے۔ ٹوٹا پھوٹا سا پرانی وضع کا مکان جو اتنے بڑے منسٹر کیا معنی ان کے کسی ماتحت اچھے عہدیدار کے بھی شایان شان نہیں۔ دفن کے موقع پر جو ہزاروں اجنبی باہر سے مسولی پہنچے انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ کسی بڑے منسٹر کا مکان اتنا معمولی بھی ہو سکتا ہے!

وضعداری کی ایک یادگار مثال یہ بھی ہے کہ عید، بقر عید کی نماز پابندی سے اپنے وطن مسولی ہی میں آکر پڑھتے تھے۔

جس سے جس طرح ایک بار ملے بس عمر بھر اسی طرح ملے۔ نخوت، خود بینی کا مفہوم ہی ان کے دماغ سے غائب تھا۔ خلوت میں جلوت میں اندر باہر کہیں بھی ملتے یہ کہیں سے معلوم ہی نہ ہونے پاتا کہ ملاقات کسی وزیر مملکت سے ہو رہی ہے۔ یو پی میں زمینداری ٹوٹی بلکہ انھی کی تحریک پر ٹوٹی، یہ بھی ایک چھوٹے زمیندار تھے اپنی زمینداری کو بچا لے جانا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ مطلق کوئی تدبیر نہ کی۔ اپنے عہدہ سے اپنی ذات کے لیے کسی ادنیٰ فائدہ اٹھانے کا سبق انھوں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ سوتیلی والدہ زندہ ہیں خاندان کے ایک صاحب سے روایت سننے میں آئی کہ ایک روز انھوں نے فرمایا ''رفیع، زمینداری تو خوب ختم کری، اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا خاندان بھوکا مرے گا سب کا انتظام کیا اپنے گھر کے لیے کچھ نہ کیا''۔ رفیع مرحوم ہنس کر بولے (اور یہ ہنس کر بولنا ان کی عادت تھی) ''کہ اماں جان گھبراتی کیوں ہیں زمینداری ختم ہونے سے کیا ہوتا ہے میں گھر پالے کر گھاس چھیلوں گا آپ بوجھ بنا کر بیچیے گا سب کی روٹی چل جائے گی''۔ یہ جواب دنیادار انسانوں کے بس کا نہ تھا۔ اس کے لیے اعتماد اولیاء اللہ کا سا ہونا چاہیے۔

مجھ سے دو ہی سال چھوٹے تھے اور مرتبہ کی بڑائی تو ظاہر ہی ہے لیکن ملتے تو اس طرح کہ جیسے سن میں مرتبہ میں ہر چیز میں بہت چھوٹے ہیں اور کچھ میری ذات سے خصوصیت نہ تھی ہر ایک کے ساتھ یہی حال تھا۔ ماہوار ہزاروں کماتے اور ہزاروں اڑا دیتے خدانخواستہ ناچ، رنگ، کھیل تماشے، شراب کباب میں نہیں، عزیزوں کنبہ والوں کی تنخواہوں میں غریبوں، مفلسوں کی اعانت میں، طالب علموں کی فیس میں اور ایسے ہر مدِ خیر میں کوٹھی مستقل مہمان سرا تھی جسے دیکھیے ٹھہرا ہوا ہے۔ دسترخوان کی وسعت کہنا چاہیے کہ کوئی حد ہی نہ رکھی آج اس یتیم کی سرپرستی کر رہے کل اس نادار لڑکی کی شادی کرا رہے ہیں ابھی ایک طالب علم کے حوالہ ایک معقول چیک کر ہی رہے تھے کہ دوسرے صاحب صورت سوال بنے ہوئے اُن سے بڑھ کر سامنے آگئے۔ ایک دربار فیض تھا کہ مسلسل جاری تھا۔ ذاتی مکان اور لباس کی بدحالی کا راز اب حل ہوا یا اب بھی راز ہی رہا؟ سیاسی مخالفین سے دوستی کا حق ادا کرتے رہنا بڑے جگر کا کام ہے۔ کانگریس و لیگ کے مناقشہ کے زمانے میں بڑے بڑوں کو اس امتحان میں بری طرح فیل ہوتے دیکھا اور اب اس ٹھنڈے زمانہ میں بھی ذرا کسی "نیشنلسٹ" صاحب کے سامنے لیگ یا پاکستان کا نام لے کر تو دیکھیے یہ ظرف اللہ نے

مرحوم قدوائی کو دیا تھا کہ اپنی نیشنلزم پر پورے سو فیصدی قائم و ثابت قدم رہ کر اسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھ کر بدگوئی نہ پاکستان کی کرتے نہ لیگیوں کو بُرا بھلا کہنے کے لیے وقت نکال پاتے۔ اپنے اسلام پر منفعل و محجوب ذرا سے نہ تھے۔ اُن کے سامنے کسی کی مجال نہ تھی کہ اسلام پر مضحکہ تو خیر الگ رہا مسلمانوں پر بھی طنز وطعن کر سکتا۔ اگست و ستمبر 1947 کے قیامت خیز زمانہ میں جب دہلی کے زمین و آسمان خون مسلم کے پیاسے نظر آتے تھے انھوں نے خدا معلوم کتنوں کی جانیں بچائیں اور کتنوں کے پاکستان پہنچ جانے کا انتظام کیا۔

بڑے اور صاحبِ اقتدار شخص کے دشمن سیکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں۔ رفیع مرحوم نے اپنی سلامت روی اور شرافت نفسی کے طفیل اپنا دشمن شاید ہی کوئی چھوڑا ہو۔ سیکڑوں یتیم آج انھیں رو رہے ہیں، صدہا بیوائیں ان کا سوگ منا رہی ہیں اور ہزارہا انسانوں کو آج دل سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا دنیوی سہارا پاش پاش ہو گیا اور وہ ایک جنگل میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور بلند سے بلند مرتبے عطا فرمائے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم: ذاتی زندگی کی چند جھلکیاں

1926 ہے اور خلافت سے کمیٹی کا زور اس وقت تک بالکل ٹوٹا نہیں ہے مرکزی خلافت کمیٹی کی میٹنگ دہلی میں ہو رہی ہے میں شرکت کو گیا اور میں نے جلسہ کے باہر ایک جوان عمر تندرست و جیہ جوان کو دیکھا۔ سفید براق، کھدّر کی شیروانی میں ملبوس، سر پر ویسی ہی اجلی ستھری گاندھی ٹوپی، چہرہ پر اچھی خاصی اور خوشنما سیاہ داڑھی، جامعہ ملّیہ والے سعید انصاری (جواب ڈاکٹر سعید انصاری ہیں) کے ساتھ، انھوں نے متعارف کیا کہ جرمن پلٹ ڈاکٹر ذاکر حسین یہی ہیں۔ اچھا وہی ڈاکٹر ذاکر حسین جن کی ذہانت و اخلاص دونوں کے چرچے اتنے دنوں سے سننے میں آرہے تھے۔ جی ہاں! شخصی تعارف یوں ہوا اور کچھ ہی دیر میں سیرتِ باطنی کا ایک جلوہ نظر آگیا کچھ بیرونی حضرات کمیٹی کے ممبروں سے اتنا قریب بیٹھے تھے کہ اجلاس کی ساری کارروائیاں اُن پر ظاہر ہو رہی تھیں اور یہ بات آدابِ جلسہ کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ مولانا محمد علی نے پکار کر کہا آپ لوگ براہ کرم اپنی جگہ چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ ملّیہ کے ہونے والے پرنسپل بخوشی اس پر رضا مند ہو گئے اور وہ جگہ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حالاں کہ ان کے جونیئر ساتھی اس میں اپنی توہین سمجھنے اور انھیں روکتے رہے۔ ڈسپلن کی پابندی کی ایسی مثال ہم لوگوں میں شاذ ملتی ہے اور

میں تو اس پہلی ملاقات میں پوری طرح متاثر ہوا۔

33 [1933] تھا کہ مولانا سیّد سلیمان ندوی کے ہمراہ دریاباد آئے اور دن بھر قیام کیا۔ جامعہ ملّیہ کی پرنسپلی خود ایک معزز عہدہ ہے کسی صورت سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی اونچے عہدیدار ہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے بات چیت ہر طرح سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خدمت گار یا پیش کار ہیں۔ یہاں کے ایک آدھ دیہاتی ٹیچر سے ملے اور اُن سے کام کی باتیں کرتے رہے۔ اس قسم کے مشورے دیتے رہے کہ رہنے سہنے میں صفائی کا چلن چلایئے۔ اسکول سے خالی اوقات میں محلّہ کی سڑکوں کی صفائی کا کام کیجیے۔ کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہے محض اپنا ہی نہیں محلّہ والوں کا بھی۔ دلّی جا کر جامعہ میں بھی ملنا ہوا ہے جب ملے تو بالکل خُرد بن کر۔ جامعہ اور مطبوعات جامعہ کے سلسلہ میں 'سچ' (صدق کا پُرانا نام) نے کئی بار نکتہ چینی بھی کی کبھی اس سے کبیدہ و آزردہ نہ ہوئے۔ تحریر میں خود صفائی پیش کی اور جب ملے تو خندہ روئی سے، کھانے کا وقت آ گیا تو اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا۔ اس نے دعوات شیراز کا لطف دیا۔ سادگی کے ساتھ صفائی تو خاص اُن کا جوہر تھا۔

45[1945] تھا یا اور کوئی سنہ، علی گڑھ میں کوئی بہت بڑا جلسہ تھا کالج یا کانفرنس دونوں میں وہاں کی جوبلی، وہاں کئی دن اُن کا ساتھ رہا۔ صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم و مغفور میرے مخدوم و مکرّم تھے لیکن اس وقت انہی کی کسی بات پر ان سے شکر رنجی ہو گئی اور میں نے ان کے ہاں جانے سے انکار کر دیا۔ انھیں خبر ہوئی تو باوجود اس کے کہ ان سے اور مرحوم سے سیاسی اختلاف تھا مجھے سمجھایا بجھایا منایا اور بالآخر ان کے ہاں بھیج کر چھوڑا۔ مخالف پارٹی والے کے ساتھ اور مدارات و ملاطفت کا برتاؤ کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ پیکر شرافت تھے۔ انگریزوں کو بُرا بھلا کہنا فیشن میں داخل تھا اور سخت ترین الفاظ اچھے اچھوں کی زبان پر چڑھے رہتے تھے ڈاکٹر ذاکر باوجود اپنی معروف و معلوم حریت مآبی کے اس سے مستثنیٰ تھے۔ نرم سے نرم تاویل ان کے افعال و اعمال کی کیا کرتے۔

48-49 [1948-49] تھا یہ نئے نئے وائس چانسلر علی گڑھ کے مقرر ہوئے تھے۔ ان کی صدارت میں پہلا جلسہ یونیورسٹی کورٹ کا تھا۔ عبدالمجید خواجہ بیرسٹر اور پرانے نیشنلسٹ بھی شریک جلسہ تھے۔ جب میٹنگ ختم ہوئی، لوگ چلنے لگے تو خواجہ صاحب نے ناخوشی کے لہجہ میں سب کے سامنے کہا۔ ذاکر صاحب اگر آپ سمجھتے ہیں جلسہ بہت کامیاب ہوا تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر بگڑ جاتا۔ مگر یہ ذرا بھی نہ بگڑے۔ خُردانہ انداز سے اور نرم لہجہ میں ان سے کہتے ساتھ

چلے جا رہے تھے، "جی نہیں میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ جلسہ مثالی طور پر کامیاب رہا۔" ایسی شرافت کی مثالیں پبلک زندگی میں کمتر ہی نظر آئیں گی۔

49[1949] ہوگا کہ کورٹ کی ایک اور میٹنگ دوپہر کے لنچ کے لیے برخاست ہوئی اور اب کی میٹنگ یونین عمارت میں بلکہ یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں تھی۔ خیال آیا کہ نماز یہاں کون پڑھے گا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صاحب بغیر شیروانی کے محض ایک کرتہ پہنے لوٹا ہاتھ میں لیے ہوئے غسل خانہ وضو کے لیے جا رہے ہیں دیکھا تو خود وائس چانسلر تھے اور جب وہ آکر جانماز پر بیٹھ گئے تو دیکھا دیکھی کچھ ممبر اور بھی آگئے۔ نماز کے تو اس وقت پورے پابند تھے اور روزے کے بھی اور حج اس کے چند سال بعد جا کر اپنے زمانہ نائب صدارت میں کر آئے۔ ذکر ان کے عام انسانی اخلاق و عادات کا ہو رہا تھا، ضمناً ان کی عبادت بھی آگئی۔

سال اب یاد نہیں بہر حال ان کی جامعہ کی پرنسپلی کا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں وہ دلی سے آئے اور میں دریاباد سے پہنچا۔ رشید صدیقی کے یہاں ہم دونوں اترے۔ اُن کا کمرہ میرے کمرے سے متصل تھا۔ فجر میں ابھی خاصا وقت باقی تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی۔ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب غسل خانہ سے وضو کر کے باہر آچکے ہیں اور جانماز پر بیٹھے کوئی ورد کر رہے ہیں۔ شاہ طالب حسین فرخ آبادی کے مرید ہو چکے تھے۔ میں نے خود انھیں تہجد پڑھتے نہیں دیکھا لیکن عجب نہیں کہ عمر کے اس دور تک وہ تہجد کے پابند رہے ہوں۔ اس کے بعد تڑکے نماز با جماعت فجر کے لیے روانہ ہو گئے۔ قرآن مجید کی عظمت بھی اس وقت تک اچھی خاصی ان پر غالب تھی۔ جامعہ سے کوئی صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے وداعی تقریب میں چلتے وقت انھیں ایک چھوٹے سائز کی کتاب پیش کی اور کہا۔ ''یہ کتاب آڑے وقتوں آپ کی مدد کرے گی جیسی کہ آپ سے قبل بہتوں کی کر چکی ہے''۔ اور یہ کتاب قرآن کی ایک حمائل تھی ان کے خاص فن تعلیمات اور معاشیات تھے اور ساتھ ہی فلسفہ کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت کے مترجم تھے لیکن دوسری طرف تفسیر قرآن سے بھی اُنسیت رکھتے تھے۔ تفسیر ماجدی جلد اول شوق سے دل لگا کر پڑھی اور دوسری جلد کی طباعت اور اشاعت کے لیے ایک ہزار کی رقم اپنی طرف سے پیش کی گو کہ میں اسے قبول نہ کر سکا۔

غالباً 57[1957] تھا۔ وہ بہار کے گورنر تھے میں پٹنہ جانے لگا تو اپنے یہاں ٹھہرانے کی فرمائش کی، اسٹیشن جو موٹر میرے لیے آیا وہ عجیب طرح کا تھا یعنی بالکل بند اور شیشوں پر کپڑا بندھا

ہوا۔اے۔ڈی۔سی صاحب نے بتایا کہ یہ موٹر سرکاری نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ذاتی اور ان کی ملکیت ہے۔ مرحوم سرکاری چیزوں سے کام لینے میں ایسی ہی احتیاط برتتے تھے۔ میری خدمت کے لیے جو ملازم صاحب تھے وہ بھی ان کے ذاتی ملازم (میاں اسحاق) تھے، کوئی سرکاری چپراسی میرے قریب نہ آپاتا تھا۔ یہ معیاران کی دیانت کا تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے ملے۔

◆◆◆

باب سوم

دلّی کے سفرنامے

مولانا نے زندگی کے مختلف ادوار میں دہلی کے بہت سفر کیے جن کا ذکر ان کی کتابوں، اخباروں اور خطوں میں ملتا ہے لیکن آزادی کے بعد دہلی کے تین سفروں کی روداد انھوں نے اپنے منفرد وشگفتہ انداز میں اپنے ہفتہ وار اخبار صدق اور صدق جدید میں بالاقساط تحریر کی جن میں سے دو سفرنامے کتابی شکل میں سیاحت ماجدی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد اپریل 1967 میں وہ عربی کی سندِ فضیلت لینے دہلی گئے جس کا حال انھوں نے 'سرکاری تقریب' کے عنوان سے صدق جدید مؤرخہ 5 مئی 1967 کو لکھا۔ یہ تقریب 11 اپریل 1967 کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں صدر جمہوریہ جناب رادھا کرشنن نے یہ سند اعزاز عطا فرمائی۔ مولانا اس سلسلہ میں دو ایک دن قبل دہلی پہنچے جہاں ان کا قیام نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اصرار پر ان کی فرودگاہ میں رہا۔ خوش قسمتی سے اس سفر میں راقم الحروف کو بھی ہم رکابی کا شرف حاصل رہا۔ ایک دن قبل اس تقریب کا ریہرسل بھی راشٹرپتی بھون میں ہوا۔

اس موقع پر ایک دلچسپ لطیفہ بھی پیش آیا، اسی تقریب میں مشہور گلوکار محمد رفیع کو بھی اعزاز ملنے والا تھا وہ مولانا سے بڑی عقیدت سے ملے اور حکیم عبد الحمید صاحب کی وساطت سے یہ درخواست پیش کی کہ وہ اپنی فنی مہارت کا نمونہ ان کے سامنے پیش کریں۔ حکیم صاحب مرحوم نے

سفارش کرتے ہوئے مولانا سے ایک محفل کی اجازت طلب کی۔اس موقع پر حکیم صاحب کے مشیر میرٹھ کے نامور عالم قاضی سجاد حسین بھی موجود تھے جن کو اس تقریب میں فارسی کی سند اعزاز ملی تھی۔مولانا نے جواب میں اس کے شرعی جواز کا فیصلہ قاضی صاحب پر چھوڑ دیا اور بات ہنسی ہنسی میں ٹل گئی۔

از مرتب
عبدالعلیم قدوائی

(1)

سیر دہلی

دوستوں، مخلصوں کا مدت سے اصرار چلا آ رہا تھا کہ دہلی کی حاضری دی جائے۔ اپنا جی خود بھی یہی چاہ رہا تھا لیکن اپنا لگا بندھا کام چندروز کے لیے بھی چھوڑ، سفر کرنا اب دشوار تر ہو گیا ہے۔ اس لیے بات برابر ٹلتی ہی گئی، گورنر ریاست بہار ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے دہلی میں ملاقات کا وعدہ پرانا تھا اس لیے جب موصوف نائب صدر جمہوریہ ہو کر دہلی آ گئے تو قدرتاً یہ تقاضا طبیعت میں زیادہ قوی ہو گیا۔ پھر بھی وقت نہ نکلنا تھا نہ نکل سکا۔ ایک زمانہ تھا کوئی ٦-٧ سال کی طویل مدت کا، اکتوبر 1923 سے 1930 تک جب پہلے ہمدرد، کامریڈ اور خلافت کمیٹی کے سلسلہ میں اور پھر نفس نفیس محمد علیؒ کے لیے بار بار اور جلد جلد جانا ہوتا رہتا تھا اور ایک دور اس سے بھی قبل کا تھا (1921 سے 1923) جب آستانۂ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ کی کشش بار بار اور کبھی کبھی لمبی مدتوں کے لیے دہلی لے جاتی تھی! آہ عمر گزشتہ کی پلٹ کر نہ آنے والی اور ہمیشہ کے لیے داغ حسرت بن جانے والی دلچسپیاں!

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا!

بہر حال جوں توں وقت تین دن کا قیام دہلی کے لیے نکالا، آمد و رفت کا ایک ایک دن اس کے علاوہ اور 18 اگست کو صبح 7 بجے کے بعد دہلی وارد ہو گیا۔

پارلیمنٹ کا اب تک نام ہی سنا تھا اور سڑک سے کبھی کبھی اس کی عمارت دیکھ بھی لی تھی،

بحیثیت مجموعی اب تک اس کی حیثیت 'دیدہ' سے زیادہ 'شنیدہ' ہی کی تھی۔ اب کی پہلی بار اس کی زیارت کا موقع ملا۔ راجیہ سبھا کا پاس مل جانا تو کچھ ایسا دشوار نہ تھا جب کہ اس کے صدر خود نائب صدر جمہوریہ تھے اور پاس (چیئرمین کی گیلری کا) انھی کے دستخط سے ملتا تھا البتہ لوک سبھا کا پاس ملنا خاصا دشوار نظر آیا اس لیے عین اسی دن اتفاق سے گورنمنٹ پر عدم اعتماد کی تحریک آرہی تھی اور اس کے شوق میں تماشائیوں کا وہ ریلا تھا کہ خدا کی پناہ! جس گیلری میں 30 کی گنجائش تھی اس میں 70-75 کس طرح دھنسے ہوئے تھے۔ خیر یہاں کا پاس بھی بالآخر محترم میزبان نائب صدر جمہوریہ ہی کے اسم اعظم کی برکت سے حاصل ہو گیا اور اسپیکر گیلری میں گھس گھسا کر رسائی ہو گئی عمارت لکھنؤ کے کونسل چیمبر کی بھی اپنے نزدیک کچھ شاندار اور مرعوب کن نہ تھی لیکن اس پارلیمنٹ ہاؤس کی ہیبت وجلال رفعت وعظمت، طول وعرض کے آگے اس کی بساط ہی کیا، اونٹ پہاڑ کے نیچے! نام جمہوریت کا لیجیے اور اصطلاح سوشلزم کی استعمال کیجیے، بادشاہت بہر حال بادشاہت ہے، دبدبہ وطنطنہ جاہ وجلال ٹھوس حقیقت کے لحاظ سے ملوک وسلاطین کے دیوان عام اور اس قصر جمہوریہ میں اصلاً فرق نہیں!

دونوں ہاؤسوں (ایوانوں) کی سرسری گھنٹہ دو گھنٹہ کی سیر سے اتنی بصیرت حاصل ہو گئی جتنی محض اخبار میں ان کی کارروائیاں پڑھتے رہنے سے مہینوں کیا برسوں میں بھی نہیں حاصل ہوتی، کہاں صورت کہاں تصور۔ کجا حقیقت کجا اس کا عکس۔ جتنا وقت یہاں صرف ہوا بحمد اللہ ضائع نہیں ہوا۔ مشاہدہ کہیے یا مطالعہ بہر حال تجربہ آموز بصیرت افروز ہی رہا۔

دہلی دارالسلطنت، مزارات ومقابر کا بھی ہے بقول حالیؔ:

چپہ چپہ پہ ہوئے یاں گوہر غلطاں تہہ خاک!

آستانہ نظام الدین اولیاء خواجہ نظام الدین سے ربط خصوصی اس سیہ قلب کو قدیم سے ہے۔ مدتوں رہ چکا ہے اور حاضری کا اتفاق بھی یہاں (خواجہ حسن نظامی مرحوم کی مہمان نوازی کے طفیل) بارہا رہ چکا ہے۔ اب کی حاضری کی نوبت سالہا سال کے بعد آئی خیال یہی تھا کہ اب قلب میں قساوت وباطن میں تیرگی بہت آگئی ہے۔ حاضری کچھ بیکار ہی سی ہو گی لیکن اللہ والوں کے فیض کا در شاید ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے۔ حاضری گو چند منٹ کے لیے ہو سکی پھر بھی وجدان کو پورے لطف وسرور کی نعمت حاصل رہی۔ وہی شفقت وہی کرمِ ذرہ نوازی وہی لطف فرمائی! بالمومنین رؤف رحیم کے جانشینوں کی شان بندہ پروری پوری تابانی کے ساتھ!

ایک مخلص کی رفاقت نے قطب مینار، بختیار کاکیؒ کے آستانہ پر بھی رسائی کرادی۔ یہاں کے بھی انوار جمال کا کیا پوچھنا!۔۔دل میں تمنا اپنے ممدوح ومحبوب مولانا حفظ الرحمٰن کی بھی تربت پر فاتحہ خوانی کی تھی، آرزو پوری ہوئی اوران مرحوم کے نصیبے پر کچھ رشک سا آ گیا، جسد خاکی کو جگہ ملی تو کہاں؟ حقیقی شاہان دہلی یعنی خاندان ولی اللّٰہی کے مزارات کے وادی ایمن میں، مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مغفور بھی مزے میں رہے قطب کے جوار رحمت میں آسودۂ خاک ہیں۔ مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام (دونوں کی تربتیں اللہ ٹھنڈی رکھے) کے مرقدوں کی طرف سے بھی بار بار گزر ہوا اور کتنی پرانی یادیں خوشگوار اور حسرتناک بھی۔ ہر بار تازہ ہو گئیں!

خواجہ حسن نظامی کی قبر کا کتبہ پڑھ کر آنکھیں قدرتا نم ہو گئیں اور مزار غالبؔ پر پہنچ کر وجدان نے شادمانی محسوس کی۔۔اپنے مرحوم عزیز شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی (سابق وزیر تعلیمات دہلی) کی قبر پر بڑی للک کے ساتھ گیا۔ لیکن جاکر غم کے ساتھ غصہ کو بھی تحریک اچھی خاصی ہوئی۔ ''قبر''! قبر تھی کہاں؟ بتانے والے کے اصرار کے باوجود یقین نہ آیا کہ کسی مسلمان کی قبر اس شکل و ہیئت کی ہوسکتی ہے! اسلامی قبر کی مطلق کوئی بھی علامت نہیں! محض ایک بہت بڑا سا بالکل گول چبوترہ بنا ہوا! ہو بہو کسی انداز ے سے کنوئیں کی جگت! یا زیادہ سے زیادہ کسی ہندو فقیر کی سمادھی کہہ لیجیے۔ واللہ اعلم یہ کن صاحب کی ''جدت'' یا دماغ کی اپج ہے اور خدا معلوم ارباب جامعہ اس باب میں اپنی ذمہ داری کیوں نہیں محسوس کرتے!

نئی دہلی کی کوٹھی جس میں قیام ہوا، اب اس میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک زمانہ میں رفیع احمد قدوائی مرحوم کی تھی۔ یہیں ایک بار آ کر اُن سے ملا تھا اور ایک بار یہاں آ کر کھانا کھایا تھا۔ قدم رکھتے ہی ان کی ایک ایک بات یاد آئی۔ سرکاری حلقوں میں اور انتظامی حیثیت سے جو شہرت انھوں نے مستعدی، کارگزاری، دیانت، فرض شناسی کی پائی اور جس طرح مسلمان وزراء کی وقعت بڑھائی یہ تو انہی کا حصہ تھا، باقی ذاتی حیثیت تو ان کی مہمان نوازی، فیاضی اور جذبۂ خدمت خلق بھولنے والی چیز ہی نہیں، پورا مہمان خانہ وہاں قائم تھا۔ گویا ایک مستقل لنگر جاری! جس سڑک پر یہ کوٹھی نمبر 6 واقع ہے اس کا نام پہلے تھا کنگ ایڈورڈ روڈ اور اب ہے مولانا آزاد روڈ۔ سڑک کی تختی پر یک بیک نظر پڑی تو اپنے ساتھ مولانا کی خوشگوار یادوں کو بھی تازہ کر گئی۔ فراخ دلی، رواداری، حلم وتحمل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان سے بھی ان کے زمانۂ وزارت میں ملاقاتیں ایک سے زائد بار ہوئی تھیں اور ان کی میزبانی کا لطف بھی اٹھایا تھا۔ اپنے تدبر، نکتہ رسی و فراست کا قائل

گاندھی جی اور جواہر لال تک کو کرلیا تھا۔ سردار پٹیل تک کو ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور مسلمانوں کو ان کی زندگی تک یہ خیال واطمینان رہا کہ کانگریس اور حکمراں جماعت میں ایک آدمی تو ہمارا موجود ہے۔ ارادات سفر سے کسی قدر غیر متعلق ہستی پھر بھی موقع پڑ جانے پر دوستوں، محبوں، بزرگوں کی خوشگوار ولذیذ یادوں کا امنڈ آنا کچھ ناگزیر سا ہے۔

دہلی میں دیکھنے کی چیزیں دس بیس پچاس نہیں بلا مبالغہ سیکڑوں ہیں اور مجھ سے کتابی کیڑے کے لیے سب سے بڑی رغبت وکشش کی چیز یہاں کی لائبریری یا کتب خانے خود بھی تعداد میں خدا جانے کتنے، خیر سب کیا معنی دو چار تک بھی پہنچ اس قلیل مدت قیام میں ممکن نہ تھی۔ جی نے ٹھانی کہ کم سے کم ایک کو تو دیکھ ہی لیا جائے اور قرعہ سرکاری کتب خانہ National Archives (قومی محافظ خانہ) پر پڑا۔ یہ محافظ خانہ کاغذات و دستاویزات قدیم قائم تو مدت دراز سے انگریزوں کے زمانے ہی سے ہے، وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ نے چار چاند لگا دیے۔ اس کی سرسری سیر کا اشتیاق بدرجۂ کمال تھا، سرکاری محکمہ اور پھر اپنے نہایت بیش قیمت قدیم سرکاری سیاسی وخفیہ کاغذات کی بنا پر نہایت درجہ حفاظت وراز داری کا مرکز پاس وغیرہ کے جھمیلے ہمت شکن لیکن وہی ''اسم اعظم'' میزبان محترم کا ایک بار پھر کارگر ہوا اور رسم وضابطہ کی خانہ پری کے بعد آخر رسائی ہوگئی۔ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اوپر نیچے تہ بہ تہ منزلوں میں کتابوں، مجلدات ودفاتر کا ایک پورا جنگل، ہر منزل کے ہر کمرے میں، ہر الماری اور اس کے ہر خانہ میں کتابوں کے انبار اور کتابیں بھی کثرت سے ضخیم وطویل وعریض۔ غرض ذخیرہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ وسیع وشاندار، لق ودق اور قلمی فرمانوں، شاہی مہروں، دستخطوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں! ساری کتابیں اگر ایک سیدھے خط میں پھیلائی جائیں تو دو چار فرلانگ نہیں وہیں کے ایک شخص نے بیان کیا کہ 20 میل کا فاصلہ درکار ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان تعداد کا سرسری جائزہ بھی دو ڈھائی گھنٹہ کے اندر آسان نہ تھا بس گویا ایک خواب سا دیکھ لیا اور اتنی بھی دیکھ بھال تاک جھانک محض مہتمم محافظ خانہ یا ڈائریکٹر آرکایوز جناب ڈی کے بھارگو ہی کی عنایت سے ممکن ہوئی جو خلق مجسم ثابت ہوئے اور ہر وقت برابر ساتھ رہے۔ یہ دوسرے علوم اور زبانوں کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر ہیں اور ان غیر مسلموں میں سے نظر آئے جن کی ذات سے ملک میں اب تک سیکولرزم کا بھرم قائم ہے۔ شعبۂ فارسی کے انچارج ترمذی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، اپنے کام میں خاصے مستعد وسرگرم دکھائی دیے۔

دتی پرانی دلی بھی 30-40 سال کے عرصہ میں بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور بعض محلّوں میں تو انقلابی حد تک، پھر بھی پہچانی جا سکتی ہے اور کسی قدر تامل کے بعد پرانے پتے نشان مل جاتے ہیں۔ اصلی انقلاب نئی دہلی اور اس کے اطراف وجوانب میں آیا ہے۔ نئی دہلی اب نئی دنیا نظر آتی ہے اور اپنی عمارتوں کی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے ہلکا اور ابتدائی نمونہ نیویارک کا! لکڑی کی جگہ ہر عمارت کا ڈھانچہ لوہے کا، اور چار چار پانچ پانچ منزلوں کی عمارتیں دور سے دیکھیے تو گمان گزرے کہ کسی ستم ظریف نے یہ سربہ فلک کابکیں کبوتروں کے لیے کھڑی کر دی ہیں! یہ دیو پیکر کبوتر خانے آج سے چند سال قبل قابل مضحکہ خیز ہوتے۔ مگر اب عین فیشن میں داخل ہیں! کوئی بھلا آدمی ایسی تعمیریں کرتا تو اپنے ہونق پنے پر نکو بن جاتا لوگ اس پر تالی پیٹ دیتے، لیکن اب یہی عمارتیں کیا وزیر کیا امیر کیا رئیس اور کیا سیٹھ سب ہی کے نشیمن ہیں اور کسی کی شامت آئی ہے جو ان پر ہنس سکے۔ بمبئی، کلکتہ کی آبادیاں تو ایسی عمارتوں سے پٹی پڑی ہیں، اب نئی دہلی کی کچھ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں انقلاب زندہ باد کی دہائی دیتی ہوئی اس راہ پر چل پڑی ہیں۔ نامور انگریزی روزناموں، اسٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز کی جگمگاتی ہوئی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی ہوئی عمارتیں سڑک پر سے بار بار نظر سے گزریں اور خیال آیا کہ انھیں شال دوشالہ والوں کی سرزمین پر کہیں کسی تنگ گلی میں ہمارے الجمعیۃ اور دعوت اور ریڈینس والے بھی اپنی کمبلوں اور گدڑیوں میں مست پڑے ہوں گے۔ عمارتوں کا تیرہ وتار ہونا کسی زمانے میں عیب تھا اب ہنر ہے۔ لکھنؤ کے کونسل چیمبر وغیرہ کا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ کمروں بلکہ کہیں کہیں برآمدوں تک میں شمع کافوری نہیں بجلی کے پُرقوت لیمپ دن دوپہر جل رہے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا سارا کام بجائے سورج کے اس مصنوعی روشنی میں انجام پا رہا ہے۔ دتی آخری پایۂ تخت ہے، اس کے قدم لکھنؤ سے بھی کہیں آگے! عجب کیا کہ کوئی ڈاکٹر صاحب یہ حکم لگا دیں کہ مصنوعی روشنی سے بینائی خوب تیز ہو جاتی ہے اور قدرتی روشنی کی مضرتوں سے امن ہو جاتا ہے۔

دریا گنج کی سڑک سے، جو کہنا چاہیے کہ نئی اور پرانی دہلی کے درمیان حد فاصل ہے، گزر بار بار ہوا، یہی وہ سڑک ہے جس پر ڈاکٹر انصاری مرحوم کی مشہور کوٹھی تھی۔ سارے قومی کارکنوں کی مستقل مہمان گاہ اور بعد کو 1947 کی تباہی تک انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی اسی کوٹھی میں رہا۔ کیسے کیسے جمگھٹے بابائے اردو عبدالحق کی ذات سے یہیں ہوتے رہتے تھے اور کوچہ چیلان کا

مشہور دفتر ہمدرد، کامریڈ اس سڑک کی ایک شاخ پر واقع پھاٹک پر تختی محمد علیؒ کے نام کی کندہ! گاندھی جی کا تاریخی شہرت والا 31 روزہ فاقہ اسی مکان سے شروع ہوا تھا۔ اس دن کا سارا ہنگامہ خیز منظر نظروں کے سامنے پھر گیا۔ بی اماں مرحومہ کا جنازہ اسی مکان سے اٹھا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے برسوں کہنا چاہیے کہ اسی مکان سے صادر ہوتے رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے پہلے حکیم اجمل خاں مسیح الملک اور بعد کو مولانا ابوالکلام کی صدارت میں یہیں ہوتے رہتے تھے اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر مکان واحدی صاحب اور راشد الخیری مرحوم کے تھے۔

اور اب کیا بتایا جائے کہ کیسے کیسے حسرتناک نقشے اس سڑک سے گزرتے ہوئے ہر بار نظر کے سامنے پھر گئے۔

ہندوستان میں چند سال ادھر تک شاید سب سے بڑا اور شاندار اور خرچیلا ہوٹل بمبئی کا تاج تھا۔ دہلی کا نیم سرکاری ہوٹل اشوک آخر اس سے بھی نمبر لے گیا۔ جی میں تھا کہ ایک بار اس کی زندگی کا بھی مشاہدہ اپنی آنکھ سے کیجیے۔ شنید اور دید میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خیر اتنا وقت کہاں تھا کہ پورے 24 گھنٹہ صرف کر کے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا جاتا پھر بھی ایک سہ پہر کو گھنٹہ بھر کا وقت تو نکل ہی آیا۔ قصر عملاً چھوٹے چھوٹے والیان ریاست کا تو کیا بعض خاصے بڑے رئیسوں کا بھی مشکل سے اس کا مقابلہ کر سکے گا۔ دوسرے ہوٹل کا ترجمہ ''فرودگاہ'' یا ''قیام گاہ'' صحیح ہوگا، اس کو تو قطعاً عشرت خانہ کہنا چاہیے۔ راحت و آسائش ہی کا نہیں تزئین و آرائش عیش و عشرت کے سارے سامان مکمل یا ''اَپ ٹو ڈیٹ' ٹھہرنے کا سب سے ادنیٰ نرخ 55 روپیہ یومیہ کا اور اس طرح درجہ بدرجہ اور سب سے اعلیٰ کمرہ 250 روپیہ روزانہ۔ ڈاکخانہ، تارگھر، بینک، مرصع جواہر نگار، زیورات کی دکان، ساڑیوں وغیرہ اور بیش قیمت زنانہ ملبوسات کی دکان وغیرہ ہر چیز ہوٹل کے اندر ہی موجود، اور شراب گھر اور ڈانس ہال، ''ناچ گھر'' کا تو پوچھنا ہی کیا، سب کے علاوہ خاص مغربی مذاق کا بڑا سا حوض یا تالاب بھی موجود، کنارے غسل آفتابی اور حوض کے اندر غسل آبی کا انتظام نیم برہنگی کے ساتھ ہر وقت لیس، ماکولات و مشروبات کی گرانی کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ چائے کی صرف ایک پیالی کی قیمت ڈیڑھ روپیہ! فرنگی مہمان ہر جنس اور ہر سن کے اس میں (اکثر غالباً امریکی) کثرت سے ٹھہرے ہوئے اور ہندوستان کے بھی راجے مہاراجے قسم کے۔ باہر کے سیاح کو کیسے یقین آئے گا کہ اس شہر کے دوسرے حصوں میں ہزارہا مخلوق رات کو بھوکی سوتی ہے اور کپڑے کی ایک ایک چادر کو ترستے اس کی عمر گزر جاتی ہے۔

اور ایک اس ہوٹل پر کیا موقوف ہے کناٹ پلیس کے طویل وعریض چوراہے پر بلکہ اس پورے فیشن ایبل بازار میں کہیں بھی کھڑے ہو کر دیکھ لیجیے کہ دنیا کسے کہتے ہیں، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے سینما کے شوقینوں اور زیورات اور فینسی ملبوسات کے خریداروں کا وہ ریلا کہ راستہ چلنا دشوار اور قطار در قطار موٹروں کا وہ ہجوم کہ سڑک پار کرنا ایک کارنامہ، ایک سیلاب رنگ و بو، ایک طوفان آرائش و زیبائش، یہ تصور کرنا ہی مشکل کہ اس ملک میں کچھ ننگے اور بھوکے بھی بستے ہیں، غفلت و مادیت، نفس پرستی کے اس ماحول میں خالق و آخرت کی یاد 24 گھنٹوں میں اگر چند لمحوں کے لیے آجائے تو ایک کرامت ہے۔

بات میں بات نکل آئی اور بات بڑھتی اور چلتی ہی چلی گئی، مخلصوں اور محبوں سے ملاقات کا ذکر ہی نہ آنے پایا۔ قیام گاہ پر پہنچتے ہی تھوڑی دیر بعد جو فون آیا وہ سپریم کورٹ کے نامور سینئر ایڈوکیٹ اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج شیو پرشاد سنہا کا تھا۔ اونچی پریکٹس والے ایڈوکیٹوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے اس لیے ان سے جواب میں عرض کیا گیا کہ آپ تکلیف نہ کریں لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے آدھے گھنٹہ میں آموجود۔ Pro Muslim یعنی مسلم دوست ہونے میں اکثر ہندوؤں سے کیا بہت سے مسلمانوں سے بھی چند قدم آگے۔ مسلم صوفیا کے بڑے عقیدت مند اور فارسی کے صوفی شعراء کے دلدادہ، شروع زندگی میں فیض آباد کے نیم مجذوب و صاحب حال بزرگ سے ایک خاص موقع پر بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور وہی تاثر اب تک قائم ہے۔

دوسری ملاقات سرکار ہند کے سابق سکریٹری محکمۂ تعلیمات اور سابق سفیر ایران ڈاکٹر تاراچند (ممبر راجیہ سبھا) سے ان کی کوٹھی پر جا کر ہوئی۔ مسلمانوں کے علوم و فنون پر گہری نظر رکھنے والے اور تاریخ اسلام کے تو کہنا چاہیے کہ ماہر۔ دیوان حافظ بلکہ مثنوی رومی تک پڑھنے والے ہندو تو خاصی تعداد میں نکل آئیں گے لیکن مکتوبات مجدد سرہندی کو اصل فارسی میں پڑھ ڈالنے والا کوئی دوسرا ہندو ان کے سوا میری محدود نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی نجی گفتگو بھی اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایسی ہوتی ہے کہ اسے برابر سنا جائے اور استفادہ کیا جائے۔ شہزادہ داراشکوہ نے اپنے زمانہ میں ہندوؤں کی مشہور اپنشد کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کرایا تھا اس کا تذکرہ ہی اب تک سننے میں آیا تھا، انھوں نے اس کے ضخیم اور تازہ فارسی ایڈیشن کی زیارت کرائی جسے خود انھوں نے ایک ایرانی فاضل کے ساتھ لے کر تصحیح و مقابلہ کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اور یہ ضخیم دفتر بجائے خود ان کے علم و

کمال کی ایک زبردست یادگار ہے۔ اسی سڑک (تغلق روڈ) پر ان سے چند قدم کے فاصلے پر ڈاکٹر سید محمود (سابق وزیر وغیرہ) کی کوٹھی ہے۔ میرے بہت قدیم ومخلص کرم فرما راجیہ سبھا کے اب بھی ممبر ہیں اور علمی، سیاسی دونوں قسم کے کام کچھ نہ کچھ کیے جاتے ہیں گو بے چارہ کی صحت اب مستقل طور پر خراب رہنے لگی ہے، ان سے ملاقات حسب توقع بے تکلفانہ رہی۔

جامعہ ملیہ سے اس کے ابتدائی علیگڑھی دور یعنی بانی جامعہ مولانا محمد علیؒ کے زمانے میں تعلق بہت گہرا اور مخلصانہ رہ چکا ہے، بعد کے دونوں پرنسپلوں عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے بھی ربط مخلصانہ رہا۔ اسٹاف کے دوسرے ارکان حافظ اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحئی، مولانا محمد سورتی وغیرہم بھی کرم فرماتے رہے اور شفیق الرحمٰن مرحوم تو اپنے عزیز ہی تھے، پرنسپل مجیب سے بھی رشتہ برادری اور قرابت کا پہنچتا ہے۔ گو نظریات الگ الگ ہیں۔ ان سے ملنا جلنا جب بھی ہوتا ہے ان کے والد ماجد مولوی محمد نسیم صاحب مشہور ایڈوکیٹ لکھنؤ کا چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ میرے بزرگ بھی تھے اور محسن بھی۔ بہر حال دعوت پاکر سہ پہر کے چائے ناشتہ پر حاضری لازم ہوگئی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر سعید انصاری، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اسی لطف وبشاشت اور تپاک سے ملے جوان کا معمول تھا۔ حافظ فیاض کی زیارت سالہا سال کے بعد ہوئی۔ قدیم جامعہ کے مخلص وفاداروں میں اب سب سے پرانے وہی ہیں، نئے چہرے بھی دو ایک نظر آئے۔ ان میں ضیاء الحسن فاروقی سے مل کر بات چیت کا جی چاہا افسوس ہے کہ موقع نہ ملا۔ سب سے بڑھ کر مستعد کارگزار صاحب فہم رسالہ جامعہ کے ایڈیٹر عبداللطیف اعظمی نظر آئے اور بعد کو یہ اسٹیشن رخصت کرنے بھی آئے۔ مغرب کا وقت قریب آگیا اور نماز جا کر محمد علی ہال میں پڑھی جو مسجد کا کام دے رہا ہے۔ جامعہ کی موجودہ حالت کی ابتری دینی واسلامی نقطۂ نظر سے بہت کچھ سننے میں آچکی تھی لیکن نماز مغرب کی حد تک تو صحیح نہ نکلی۔ نمازیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور چھوٹے طلبہ تو کثرت سے تھے۔ مسلمان طلبہ کی تعداد کا مسئلہ بہت اہم تھا اور بہت اہم ہے اور خدا نہ کرے کہ اسلامی عنصر کی اہمیت گھٹتی اور رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جائے۔ گو کہ یہ بھی ظاہر ہے کہ قدیم اسلامیت کو علیٰ حالہ قائم رکھنا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔

ایسی ہی ایک دوسری پُر لطف صحبت بڑے پُر تکلف چائے ناشتہ کی صحبت درگاہ حضرت نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے حسن ثانی نظامی (یا حسن نظامی ثانی) کے ہاں منعقد ہوئی۔ خواجہ صاحب کی گوناگوں حیثیتیں اور جو کچھ بھی ہوں بہر حال وہ اردو کے ایک بڑے

اچھے لکھنے والے اور بڑے اچھے دوست، ملنسار، متواضع، مہمان نواز اور خدمت کا شوق و ولولہ رکھنے والے تھے، مدتوں ان سے تعلقات مخلصانہ بلکہ عزیزانہ رہے اور بارہا ان کے ہاں مہمان رہ کر نمک خواری کا لطف اٹھایا۔ اخیر 1922 میں مسلسل کئی ہفتہ ان کے مہمان خانہ میں قیام کے گزارے تھے۔ اب کی عصرانہ اسی مکان کے ایک حصہ میں رہا اور 40 سال قبل کی بے ثبات و تغیر پذیر دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا! لڑکے کم سے کم مہمان نوازی کی حد تک تو اپنے والد بزرگوار ہی کے نقش قدم پر نظر آئے۔ ان کی والدہ کی خدمت میں بڑے تاثر کے ساتھ اپنا سلام نیاز کہلایا۔ یہیں جمعیۃ العلماء کے ناظم مولانا محمد میاں سے ملاقات ہوئی اور جامعہ کے استاد مولانا زین العابدین صاحب سے بھی دوبارہ۔ جمعیۃ العلماء کے ذکر پر نام صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط کا یاد پڑ جانا قدرتی ہے ان سے لطف مکالمت و مجالست دوبار رہا۔ ایڈیٹروں کی صف میں دل درد مند کے ساتھ ایسا مسکین و بے زبان بلکہ بے نفس کم ہی دیکھنے میں آیا، عمر کے لحاظ سے شاید دیرینہ سال لیکن قلم کے لحاظ سے ماشاء اللہ ہر طرح جوان تنومند۔ اللہ ان کے اخلاص اور ان کے قلم کی روانی دونوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

جماعت اسلامی ہند کے نام اور اس کی فعالیت سے ملک کے طول و عرض میں کون ناواقف ہے۔ اس کے امیر مولانا ابواللیث ندوی اپنے اخلاص ہی نہیں بلکہ اپنی آدمیت، مصالحت پسندی، سنجیدہ مزاجی و متانت فکری کے لحاظ سے بھی ہر طرح اس منصب کے اہل ہیں اور رزم سے کہیں زیادہ بزم کے آدمی ہیں۔ فرط محبت انھیں اسٹیشن بھی کھینچ لائی اور پھر ایک دن اپنے دفتر میں دھوم دھام سے کھانا کھلایا (یہ دھوم دھام نہ تکلف کے مرادف ہے اور نہ اخلاص و سادگی کے منافی) یہیں روزنامہ دعوت کے کارکنوں سے ملاقات رہی اور نئے انگریزی ہفتہ وار Radiance کے ایڈیٹر عبدالرؤف (مدراسی) سے تعارف ہوا۔ دوسروں کے درجنوں انگریزی روزناموں اور ہفتہ واروں کے سامنے انگریزی کے اس ایک مسلم ہفتہ وار کی بساط ہی کیا ہے۔ لیکن اپنی ملت کی قسمت کو کیا کہہ کر روئیے کہ اتنا کام بھی کسی دوسرے سے نہ بن پڑا۔ توفیق ہوئی تو اسی جماعت کو ہوئی اور پرچہ نکالا بھی تو اپنی مخصوص جماعت کا نقیب بنا کر نہیں بلکہ ساری امت اسلامی کی آواز کی حیثیت سے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی والے تقریر، تحریر، تنظیم میں خوب برق ہیں، لیکن خشیت قلب کی دولت ان کے حصہ میں کچھ واجبی ہی آئی ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح ہو بھی تو اس میں شرمانے جھجکنے کی کیا بات ہے، کلمۂ ایمان میں اقرار لسانی کو تصدیق قلبی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا ہے بلکہ

ذکر میں مقدم رکھا گیا ہے۔ اسلام کی تنظیمی پہلو کو نمایاں کرنا بھی دین کی خدمت اور حق ہی کی ایک شکل ہے۔

دہلی میں چاندنی چوک سے اگر گزرنا ہوا ہو تو عجب نہیں کہ نظر گھڑیوں کی ایک بڑی شاندار دوکان پر پڑی ہو پیکارڈ واچ کمپنی کے نام سے، اس کے مالک الحاج محمد شفیع صدق و مدیر صدق کے قدیم مخلص ہیں اور ان کے چچا پریمیر واچ کمپنی کے مالک، گویا پیشہ ان کا خاندانی اور اس اعتبار سے انھیں ''ابوالوقت'' اگر قرار دیا جائے تو کیا بیجا۔ دن میں کامیاب تاجر اور رات میں عبادت گزار، تبلیغی جماعت کے خصوصی خادم و کارکن، دین و دنیا کی یہ جامعیت خوش نصیبوں کے حصہ ہی میں آتی ہے۔ اپنے گھر جا کر کھلایا پلایا، بعض مزارات پر ساتھ لے گئے اور طرح بھی خاطر مدارات میں لگے رہے اور جب میں دہلی سے رخصت ہو رہا ہوں تو تحفہ تحائف کا بنڈل لیے ہوئے اسٹیشن پر موجود۔ ناشتہ کی لطافت و شیرینی یوں ہی کیا کم تھی اس پر ان کے اخلاص کی حلاوت کا اضافہ۔

دلّی بے شمار قابل دید چیزوں کا شہر ہے۔ لیکن یہاں پہنچ پر اگر آپ نے دواخانہ ہمدرد اور اس کے متعلقات کو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا، یونانی دواخانہ بڑے بڑے اور شہرت و نیک نامی والے پہلے بھی تھے اب بھی ہیں اور کئی تو اسی شہر دہلی میں ہیں، لیکن ہمدرد کی آن ہی دوسری شان ہی نرالی ہے:

بسیار خوباں دیدہ ام الا تو چیزے دیگری

دواخانہ اور تو خود ہی ''ایک بحر ناپیدا کنار'' خدا جانے کتنے شعبوں اور صیغوں میں تقسیم اور ہر شعبہ اپنی وسعت، اپنے تنوع، اپنے انضباط، اپنے سلیقہ، اپنی کارکردگی، اپنی صفائی، غرض اپنے ایک ایک کرشمہ سے دامن دل اور دامان نظر دونوں کو اپنی طرف کھینچ لینے والا۔ شربت سازی کے شعبہ میں قدم رکھیے تو بے پیاس کی پیاس لگ آئے اور خواہ مخواہ اس آب طہور کے گلاس پر گلاس چڑھانے کو جی چاہے۔ سیکڑوں نہیں ہزار ہا بوتلیں خوش رنگ اور جھلکتی ہوئی وردی پوش پلٹنوں کی طرح امراض سے مقابلہ کو صف بستہ اور ماء اللحم کی تو پوچھیے ہی نہیں۔ حافظ شیرازی اور ریاض خیرآبادی اگر اس کوچہ میں آنکلتے تو بادۂ گلگوں کے جاموں پر لاحول بھیج کر عجب نہیں اس کے زمزمے سنانے لگتے اور شیخ کے وعظ اور محتسب کے تازیانے کے بغیر ہی رند بلانوش سے صوفی صفا کوش بن جاتے۔ جہاں دوائیں کٹتی ہیں وہاں کے کھرل دیکھیے تو دیو پیکر۔ ظفر علی خانی صحافت کے لفظ ''البرز شکن'' کی یاد دلانے والے۔ غرض مرکبات، مفردات، تشخیص امراض وغیرہ کے جس

حصہ میں بھی جائیے قدرتِ حق کے نظارے کا لطف اٹھائیے اور حکیم صاحب کے حسن انتظام اور ان کے کاروبار کی وسعت وعظمت پر عش عش کیجیے۔ جزئیات کی تفصیل اگر بیان ہو تو عجب نہیں کہ پڑھنے والے کو ٹھوس واقعات اور سنجیدہ حقائق پر گمان 'فسانۂ عجائب' کا گزرے اور حکیم صاحب کے کتب خانہ کی ماشاءاللہ وسعت وجامعیت تو خود ایک مستقل عنوان کی محتاج۔

اور یہ سارا لق ودق کاروبار اور لکھوکھا کی جائیداد بجائے ذاتی ہونے کے اب ایک وقف کے ماتحت اور حکیم صاحب بجائے اس کے مالک بلا شرکت غیرے ہونے کے محض اس کے متولی و منتظم، یہ ایثار ہی اپنی مثال بس آپ ہے اور حسن انتظام جہاں عالی دماغی کی دلیل ہے وہاں یہ ایثار شہادت دے رہا ہے قلب کی فراخی اور روح کی بیداری کی۔ اور جیسے کہ یہ سارے فضائل وکمالات ناکافی ہوں اب حکیم صاحب نے کمال عالی ہمتی سے بڑے پیمانہ پر ایک جامعہ طبیہ کا انتظام ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس کے لیے چن چن کر ملک کے اطباء حاذقین کو جمع کر لیا ہے، چنانچہ ہمارے لکھنؤ کے بھی نامور طبیب شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کو بھی لکھنؤ سے کھینچ بلایا اور شیخ الجامعہ انہی کو بنایا ہے۔

دہلی کی لکھنؤ پر ایک اور تازہ ترین فتح! چنانچہ یہ راز وہیں شب کے کھانے کی دعوت میں حکیم صاحب سے مل کر کھلا اور جہاں دلّی کے نصیبے پر رشک ہی آیا کہ انھیں لکھنؤ سے چھین لیا وہیں لکھنؤ کی محرومی پر دل میں کچھ کڑھن بھی محسوس کی "باسایہ ترا نمی پسندم" کی بات کچھ غلط تھوڑے ہی ہے۔ عین فطرت بشری کا اقتضا ہے۔

دلّی کے دو ہی دیسی ادارے ایسے ہیں جنھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ ان کا نام پھیل گیا ہے بلکہ بیرون ہند بھی ان کے چرچے، تذکرے ہو رہے ہیں ان میں سے ایک نیک نام اور تقریباً بین الاقوامی سا ادارہ یہی ہمدرد کا ہے۔

حکیم صاحب اس سے بیک وقت نام ہندوستان کا بھی اونچا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا بھی۔ وطن وملت دونوں کی خدمت ساتھ ساتھ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ رہا دوسرا ادارہ اسی زور وشور کے ساتھ قریہ قریہ اپنا نام پہنچانے والا۔ تو اب اس کا نام کیا لیا جائے اور اس کی نشاندہی کن لفظوں میں کی جائے۔ مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھکا دینے کے لیے کافی ہے۔

رودادِ سفر کا آخری نمبر بھی ادھیا گیا اور میزبان محترم کا ذکر اب تک نہ ہونے کے برابر رہا، گو ان کا مرتبہ اخلاص اس سے برتر ہے کہ وہ اپنی مدح سننے کے منتظر یا اپنے ذکر خیر کے مشتاق رہیں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی بڑی لمبی چوڑی عبارت ان کے تعارف کے لیے ضروری بھی نہیں۔
جامعہ ملیہ سے بعد نماز مغرب جب میں رخصت ہونے لگا تو میرے قدیم و بے تکلف دوست ڈاکٹر سعید انصاری نے بھرے مجمع میں مجھ سے سوال کر دیا کہ کہیے گورنر بہار اور نائب صدر جمہوریہ میں آپ نے کچھ فرق پایا ہے۔ جواب اس طرح بے تکلف چٹ پٹ یہ عرض کر دیا گیا کہ گورنر بہار! میں نے تو پرنسپل جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ میں کوئی فرق نہ پایا، اور لوگ یہ جواب سن کر ہنس پڑے۔ ہنسی تائید و تحسین کی تھی انکار یا استعجاب کی نہ تھی۔

لطیفہ نہیں واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو سوا داڑھی میں قصر ہو جانے (اور اس قصر کو بھی اب مدت ہو چکی ہے) اور عمر کے طبعی تقاضوں کے اور کوئی فرق نظر نہیں آیا، نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔ وہی سادگی، وہی قناعت، وہی صفائی، وہی میٹھی زبان، وہی ہر ایک سے تواضع، وہی تصنع و تکلف سے اجتناب، وہی تعیشات سے احتیاط، وہی فرض شناسی، وہی اسلام دوستی، وہی بے تعصبی، وہی ذوق مطالعہ، وہی گھریلو پن اور وہی شیروانی پاجامہ۔ تین دن کے قیام میں میں نے یہ دیکھا کہ چائے لانے، کھانا کھلانے وغیرہ کی ساری خدمت اپنے ذاتی ملازم (اور ملازم کیوں انھی کی زبان میں "رفیق") قدیم سے لیتے رہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انھیں چپراسی وغیرہ سرکاری ملازموں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ جس کوٹھی میں رہتے ہیں وہ محض منسٹروں کے رہنے کی ہے، حالانکہ گورنمنٹ ہاؤس میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور گورنر اور منسٹر کے معیار معیشت کے درمیان فرق ہی نہیں فرق عظیم ہے۔ گورنری سے ترقی پا کر اس منصب عالی پر آنے کے بعد انھیں حق تھا کہ اپنے لیے کوٹھی بھی ویسی طلب کریں جو اپنی آرائشوں کے لحاظ سے ایوان صدارت سے کچھ ہی کم ہوتی لیکن ان کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی نے صدر کیا معنی وزیر اعظم کی ٹکر کی بھی کوٹھی طلب نہ کی اور جو جگہ بھی رہنے کو مل گئی بس اسی پر ہنسی خوشی گزارا کرنا شروع کر دیا۔ شرافت اور وضعداری ان کا امتیازی جوہر ہے اور اسلام دوستوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی مذہبیت کا سکہ اونچے حلقوں میں دلوں پر بیٹھا ہوا ہے چنانچہ یہ روایت معتبر ذرائع سے سننے میں آئی کہ کسی اونچے سرکاری ڈنر کے موقع پر محض اتفاق سے ایک ایسے افسر کے پاس سے گزرے جو مصروف نائے و نوش تھے تو وہ معاً تعظیم کے لیے کھڑے تو ہو گئے مگر جس ہاتھ میں گلاس تھا اس کو پیچھے کر کے۔ ایک لطیفہ بھی سن لیجیے! اب کی ملاقات میں ڈاکٹر تارا چند نے اپنی بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہوئی ایک ضخیم فارسی کتاب دکھائی، یہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب اپنشد کا فارسی ترجمہ دارا شکوہ کا کروایا ہوا ہے، کتاب قابل

داد ہے، اس کی شکل دیکھ کر دل للچا کر رہ گیا۔ کتاب چھپی ہوئی ایران کی ہے، ہندوستان میں اس کے ملنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، میں نے اس کا ذکر میزبان سے محض ضمناً کر دیا اور اپنے اشتیاق کا قصداً مطلق ذکر نہ کیا، یہ بات آئی گئی ہوگئی، تیسرے دن جب میں چلنے لگا تو عین رخصت کے وقت موصوف یک بیک بولے کہ ایک کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں، ڈاکٹر تاراچند کی اُپنشد، میرے پاس اس کا ایک نسخہ خالی ہے۔ میں دنگ رہ گیا کہ اپنے اشتیاق کا تو میں نے ان سے کچھ ذکر بھی نہ کیا تھا، انھیں اس کا علم کیسے ہوگیا۔ بس زبان سے صرف اتنا کہہ سکا کہ اچھا اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ کشف الصدور بھی ہونے لگا ہے۔

دکھ کی بات ہے کہ آپ کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ ایک میل روزانہ صبح کی مشی جاری ہے اور کھانا بھی بالکل پرہیزی اور نپا تلا کھاتے ہیں پھر بھی دو شکایتیں زبردست عارض ہیں ایک ذیابیطس اور دوسرے مرض قلب، شکایتیں دونوں ہی سخت ہیں لیکن شافی برحق کے لیے سختیوں کو آسانیوں میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے، اور عجب کیا کہ ان کے حق میں لاکھوں کروڑوں کی دعائیں سن ہی لی جائیں۔ قلب سے مراد افسوس ہے کہ طبی قلب ہے کاش مراد وہ قلب ہوتا جو صوفیا کے دماغ میں بسا ہوا اور شاعروں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے، وہ قلب جس کے آزار کی تمنا اور دعا بڑے بڑے عارفوں نے کی ہے:

عاشقی پیدا ست از زاری دل
نیست بیماری چو بیماریِ دل

عشق اگر اپنے جائز محل میں مجازی ہو جب بھی رہبر حقیقت بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے:

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سرست
عاقبت مارا بداں شے رہبر ست

اگر شروع ہی سے حقیقی ہے جب تو بندے کے حق میں ایک بڑا انعام الٰہی ہے۔

(صدق جدید 6 ستمبر 1963)

(2) چند گھنٹے دہلی میں

یوپی سرکار کی قائم کی ہوئی ایک مجلس ہندی سنسکرت اور اردو کتابوں سے متعلق ہے۔ مستقل صدر اس وقت راجستھان کے گورنر ہیں۔ اس تقریب سے کمیٹی کے اجلاس جے پور میں طلب

ہوتے ہیں۔ 14 مارچ کے اجلاس کے لیے 13 مارچ کی شب براہ دہلی جے پور جانا تھا۔ کالکا میل تین گھنٹہ لیٹ ہوکر دہلی 12 بجے شب پہنچی جس سے ادھر کی گاڑی نہ مل سکی، مجبوراً اور ارادہ کے خلاف کچھ گھنٹے دہلی میں گزارنے پڑے۔ اس تھوڑی سی مدت میں جسم کی آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھوں نے بھی بہت کچھ دیکھ ڈالا۔

دہلی آمد و رفت کا سلسلہ 1913 سے قائم ہے۔ اس 51-52 سال کے عرصہ میں کیسے کیسے انقلابات نظر سے گزر گئے، دنیا کیا سے کیا ہوکر رہی! کیا زور، کیا طنطنہ، کیا ہمہمہ برطانیہ کا تھا۔ 1913 میں دہلی کو دارالسلطنت بنے ہوئے دو ایک ہی برس ہوئے تھے، در و دیوار تک انگریزی حکومت کا کلمہ پڑھ رہے تھے اور دلوں پر نقش عظمت و احترام سے کہیں بڑھ کر رعب و داب، ہیبت و جلالت اور اقبال مندی کا قائم تھا۔ ہر شمس العلماء چمکا ہوا تھا اور دھوم ہر خان بہادر کی مچی ہوئی تھی۔ پھر وہ دور بھی دیکھا جب دہلی اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور آصف علی کی تھی اور خان بہادر مولوی عبدالاحد (مطبع مجتبائی والے) اور شمس العلماء مولوی سید احمد (جامع مسجد والوں) کا ستارہ گردش میں آچکا تھا اور دوران پر کسمپرسی کا طاری تھا۔ حسن نظامی اور ان کے رفیقوں ملا واحدی، دیوان سنگھ مفتونؔ اور بھیا احسان کا طوطی بول رہا تھا۔ پادری اینڈریوز انگریز ہوکر ہندوستانیوں سے بڑھ کر ہندوستانی تھے۔ راشد الخیری بھی اپنے محدود حلقہ میں نوا سنجی کی داد لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ ساتھ مولانا شوکت علی بھی نیم دہلوی بن چکے تھے۔ سید جالبؔ، میر محفوظ علی، میر باقر علی داستان گو، آصف علی، جسٹس عبدالرحمٰن، خواجہ غلام حسین سب سے ملاقاتیں پہلی بار کامریڈ و ہمدرد کے دفتر ہی میں ہوئیں۔ فاضل جید مفتی کفایت اللہ اور واعظ شیوہ بیان مولانا سعید احمد کی زیارت بار بار ہوتی رہی۔ ملا واحدی کے ہاں جاڑوں کے موسم میں صبح کی نہاری کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی مہمان داری کا لطف دنوں نہیں ہفتوں اٹھایا اور جی بھر کر قوالی سنی۔ پھر وہ دور بھی نظروں کے سامنے پھر گیا جب خلافت کمیٹی کے جلسے بار بار ہوا کرتے تھے اور مولانا لقاء اللہ پانی پتی کے نورانی چہرے کے ساتھ عارف ہسوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، مہر صاحب، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عرفان خاں کی صورتیں لوح حافظہ پر ابھر آئیں۔ 1924 سے 1929 تک روزنامہ ہمدرد کے سلسلے میں خدا جانے کتنی بار دہلی کی حاضری ہوتی رہی اور محمد جعفری، سعید احمد بریلوی، مولوی احتشام الدین سب ہی سے خلا ملا رہا۔ جامعہ کے شفیق الرحمٰن قدوائی تو خیر اپنے عزیز ہی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر

حسین خاں، مولانا اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحئی فاروقی، ڈاکٹر سعید انصاری بھی رنگ اخلاص میں کچھ کم نہ رہے۔ وقت کا بائسکوپ ذرا اور کھسکا تو دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر یاد پڑا اور ساتھ ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برج موہن ناتھ کیفی کے ہنستے بولتے چہرے ابھر آئے۔ سید مرتضیٰ علی، حکیم عبدالحمید (ہمدرد دواخانے والے)، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید اکبر آبادی اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہاں تک کہ زمانہ طلوع آزادی کا آجاتا ہے۔ اب دور مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر سید محمود اور شیو پرشاد سنہا کا آجاتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی اور مجیب صاحب تو برادری اور وطن ہی کے تھے۔ کثرت سے یہ شمعیں اب گل ہو چکی ہیں، دو چار جو باقی ہیں وہ چراغ سحر کے حکم میں ہیں۔

قیام جتنی دیر بھی رہا دہلی کے ایک مخلص قدیم حاجی شفیع گھڑی والے (ریکارڈ واچ کمپنی) کے ہاں رہا۔ مولانا محمد میاں (جمعیۃ العلماء والے) کی ''دید'' تو بس برائے نام ہی رہی۔ البتہ ان کے مناقب کی ''شنید'' اپنے میزبان کی زبانی بڑی خوش آئند رہی اور یہاں جتنی دیر ملاقات صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط سے رہی اس نے کلفت سفر کو بھلا دیا۔ ایسی بے زبان اور بے نفس ہستی، صحیح معلومات اور صائب رائے اور دل درد مندر کھنے والی وقت کے صحافتی حلقوں میں کم ہی نظر سے گزری ہے۔ ان کا ایڈیٹوریل صفحہ معلوم ہوتا ہے کہ روشنائی سے نہیں خون جگر سے لکھا ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا الہامی مصرع:

در مناجاتم ببیں خون جگر

میں ان کے حق میں ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں پڑھا کرتا ہوں:

در مقالاتم ببیں خون جگر

اور اس کمال جذب کے باوجود مجذوب نہیں، سالک ہیں۔ واللہ اعلم کس مجاہدہ سے کام لے کر جوش پر ہوش کو حاکم رکھے ہوئے ہیں۔ کسی دوسری قوم میں ہوتے تو آج ان کی پرستش ہوتی یہاں پُرسش ہی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ دوسری ملاقات امیر جماعت اسلامی مولانا ابواللیث صاحب اور ان کے رفیق ماسٹر افضل حسین سے رہی جنھوں نے درسی کتابوں کے ذریعہ تعمیری خدمت کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ان دونوں کی شرافت کو دیکھ کر قدرتِ خدا یاد آئی کہ انہی کی جماعت میں کیسے کیسے ''ذات شریف'' بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مگر پھر اقبال کا قول یاد آگیا کہ

اُمتیوں نے تو اپنے پیغمبر تک کو غیروں کی نظر میں بدنام کر کے چھوڑا ہے۔ افسوس ہے کہ ریڈینس (Radiance) والوں سے بھی ملاقات کی مسرت حاصل نہ کی جا سکی۔

اسٹیشن سے بلی ماران تک کی مسافت ایک بار پیدل طے کی۔ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر یہ اتفاق سالہا سال کے بعد ہوا اور کیسی کیسی یادیں اس وقت کی تازہ ہو گئیں۔ وہ گھنٹہ گھر سرے سے غائب تھا جو چاندنی چوک کی مستقل رونق اور زبردست یادگار رہا تھا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ آزادی کے بعد جہاں ایک طرف کونے کونے پر مورتیاں نصب ہوں گی، گھنٹہ گھر جیسی کارآمد چیزیوں آناً فاناً ہست سے نیست ہو جائے گی:

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

وقت ہی کہاں تھا، نہ جامع مسجد کی حاضری ہو سکی اور نہ اس کے سامنے والے اس میدان کی جس کے ایک کونے پر آرامگاہ مولانا شوکت علی کی ہے اور وسط میں مولانا ابوالکلام کی، اور مولانا حفظ الرحمٰن کے مزار تک پہنچنے کا وقت نکالنے کا سوال ہی نہ تھا۔

(صدق جدید 9 اپریل 1965)

(3) دہلی میں ایک سرکاری تقریب میں

''ایک نااہل نوازی'' کے عنوان سے 2 ستمبر 1966 کے پرچے میں جو کچھ عرض ہوا تھا اگر اسے سامنے رکھ لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ بہر حال مارچ 1967 میں حکم پہنچا کہ 15 اگست کو یوم جمہوریہ کے سلسلے میں ''عربی اسکالر'' کی حیثیت سے جس سند اعزاز کا اعلان ہوا تھا وہ سند صدر جمہوریہ کے ہاتھ سے 11 اپریل کو عطا ہو گی۔ دہلی ایک دن قبل پہنچ جاؤ۔

دربار میں حاضری کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، گو اس قصر معلیٰ کی سرسری زیارت ایک بار قبل کسی پارٹی کے سلسلے میں ہو چکی تھی۔ قصر معلیٰ کا لفظ شاید مبالغہ سے خالی ہے، اللہ اللہ! کیا شان و آن، کیا جاہ و جلال ہے! زینت و جمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی نہ ہو گا تو اور کہاں ہو گا؟ راشٹرپتی بھون یا قصر شاہی اپنی وسعت و رفعت میں شان و شوکت میں شاہان سابق کے کسی قصر و ایوان سے کم نہیں، اور آخر کم ہوتا ہی کیوں؟ انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کے زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ شہنشاہ ہند و برطانیہ کے نائب السلطنت کے لیے تھا۔ وائسرائے بہادر تو اس میں مستقل رہتے ہی تھے خیال اس کا بھی رکھ لیا گیا تھا کہ برطانیہ کے ولی عہد اور کبھی خود تاجدار برطانیہ بھی اس

میں قیام فرمائیں گے اور دوسرے ملوک وسلاطین بھی بہ طور چندروزہ مہمان ٹھہرا کریں گے۔ صناعی اور تکلفات کے لحاظ سے یہ عمارت عہد شاہجہانی کی شاہی عمارتوں کے ٹکر کی۔ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ریڈنگ بیچارے سب اسی خیال میں تھے کہ وہی اور ان کے بھائی بند ہمیشہ قیمتی پتھروں کے ان قلعوں میں رہیں گے اور کوئی انھیں یہاں سے بے دخل نہ کر سکے گا۔

کمروں کی تعداد سننے میں آیا کہ ڈھائی سو ہے۔ برآمدے، ہال، گیلریاں، صحن، نشاط خانے، کھیل وتالاب گھر، حوض، غسل خانے، باورچی خانے خدا معلوم کتنے۔ وسیع وبلند برآمدے خصوصاً جاڑے، گرمی، برسات ہر موسم کے لائق۔ کُل عمارت مع اپنے ملحقات کے کئی فرلانگ (عجب نہیں کہ کئی میل) کے دور میں۔ قدم قدم پر چوکی پہرے۔ باہری پھاٹک سے لے کر دربانوں، محل داروں کی پلٹن، بلم بردار مسلح سپاہیوں محافظوں کی فوج کی فوج۔ اور انہی کے درمیان اور انہی کے جھرمٹ میں وہ رہ رہا ہے جو ''جمہوریہ'' ہند کا صدر ہے۔ ایک خاموش، سادہ مزاج، قناعت پسند، مفکر وفلسفی، اہل قلم۔ اپنے داخلہ کے پہلے ہی لمحہ سے دیر تک یہ سوچ دل میں آتی رہی کہ عیش وتنعم کے اس سیلاب، غفلت وتکلف کے اس تلاطم میں اگر کسی کو اپنی بندگی کا احساس کبھی کبھی بھی ہو جائے اور اپنے پالنہار کی یاد اس کے دل کو کسی بھی وقت گرما دے تو بڑھ کر اس کے ہاتھ چوم لیجیے اور اس میں کوئی نہ کوئی شمہ فقر وعرفان کا مان ہی لیجیے۔

دربار کا وقت 5 بجے سہ پہر کا تھا اور ہر ایک کو اپنے ساتھ دو مہمان لے آنے کی اجازت بھی تھی۔ ہدایت تھی کہ لباس درباری ہو یعنی سیاہ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ، جو پنڈت جواہر لال نہرو کا لباس تھا۔ اور یہ بھی حکم تھا کہ آدھ گھنٹہ قبل ضرور پہنچ جایا جائے۔ لباس کے سوا اور ہدایتوں کی تعمیل ہوئی اور کارڈ اور پاس کی جابجا چیکنگ ہونے کے بعد بالآخر اپنے نمبر کی کرسی ڈھونڈ ملی۔ خیال تھا کہ طلبی صرف چند اہل قلم کی ہوئی ہوگی اور صدر محترم کے لطف وکرم کے مخاطب ہم خادمان علم ہی ہوں گے۔ دربار ہال میں باریابی پر کھلا کہ اندازہ تمامتر غلط اور محض اپنے طبقہ سے متعلق حسن ظن پر مبنی تھا۔ اعزاز علمی کی سند پانے والے تو کُل چار پانچ تھے، تین یا دو سنسکرت والے اور ایک یا دو فارسی کے اور ہم خاکساروں کی کرسیاں آخر میں سب سے آخر میں تھیں کہ اس کے بعد کوئی اور قطار نہ تھی۔ اگلی قطاروں پر صف بہ صف پچاسوں ہی دوسرے حضرات تھے۔ سرکاری خطابوں سے مشرف ہونے والے، پدم بھوشن، پدم وبھوشن، پدم شری وغیرہ، اور انہی میں علاوہ حکام والا مقام اور علوم وفنون کے استادان کرام کے فلاں گویے بھی تھے اور فلاں سازندے بھی۔

ایاز قدر خود بہ شناس کی حقیقت ایک بار پھر روشن ہوئی اور دل کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ظاہر کی آنکھوں پر بھی روشن ہو گیا کہ آج کی سرکار بھی ارباب نشاط کی سر پرستی اور ہمت افزائی میں پورا کام کر رہی ہے جو اگلے راجے مہاراجے اور قیصر و سلطان کرتے چلے آئے ہیں۔

ٹھیک وقت پر صدر محترم برآمد ہوئے اور انہی تکلفات کے ساتھ جو اگلے شاہوں اور شہنشاہوں کے نام کے ساتھ مربوط ہیں، سونے کی کرسی پر براجمان ہوئے۔ نگاہ روبرو کی صدائیں راشٹر بھاشا میں نقیبوں نے لگائیں اور استقبال اس بھاشا کے قومی ترانے کے ساتھ کیا گیا، پھر ایک ایک کے نام کی پکار اور پیشی ادب و قاعدہ کے ساتھ ہوتی رہی کہ پیش گاہ مبارک سے اتنے انچ کے فاصلہ پر فلاں رخ سے کھڑے ہو جائے اور جب صدر محترم کھڑے ہو کر تمغہ یا سند عطا کر چکیں تو فلاں زاویہ سے ہٹا جائے کہ کہیں پشت چہرۂ مبارک کی طرف نہ ہو جائے، وقس علیٰ ھٰذا۔

بیسویں صدی کے ثلث آخر میں مغلئی دربار کے آداب اور کورنشات کا نقشہ نظر کے سامنے پھر گیا۔ اپنی باری جب آخر میں آئی اور درباری نہیں معمولی و عام لباس میں، تو پہلے ایک ریشمی سفید چادر عطا ہوئی اور پھر ایک لمبے بڑے خریطے کے اندر رکھی ہوئی سند علمی خدمات کی ایک طرف رخ پر اردو اور دوسرے پر ہندی میں لکھی ہوئی مرحمت ہوئی۔

ساری کارروائی ایک گھنٹہ کے اندر ختم ہو گئی اور اس کے بعد پروگرام میں ایٹ ہوم درج تھا۔ دربار ہال سے چل کر پاس کے دوسرے وسیع اور لق و دق ہال، اشوک ہال میں آنا ہوا۔ یہاں بیٹھنے کا کوئی نظام نہ تھا اور کھڑے کھڑے کھانے پینے کا جو تکلیف دہ اور خالص فرنگی رواج چند سال سے چل نکلا ہے اس پر اس شاہی محل کے اندر عمل تھا۔ یقین تھا کہ میزیں کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوں گی۔ ایٹ ہوم صدر جمہوریہ کی طرف سے تھا، نظر اٹھا کے جو دیکھا تو اچھے اچھے ثقہ لوگ کچھ گلاس ہاتھ میں لیے شربتوں سے شاد کام ہو رہے ہیں اور کچھ چائے کی پیالیاں بھاپ نکلتی ہوئی ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے بعد یہ راز منکشف ہو کر رہا کہ اس شاہی ایٹ ہوم میں صرف مشروبات ہی ہیں۔ زمانہ کے گرم و سرد کی مناسبت سے صرف گرم یا صرف ٹھنڈے پانی۔ ماکولات کے قسم سے نام کو بھی کوئی چیز موجود نہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ یہ کفایت شعاری اور سادگی کا سبق دینے کے لیے ہے۔ اس گرانی اور خشک سالی کے دور میں۔ اور یہ کفایت کا درس عین اس وقت دیا جا رہا ہے جب اسی ہال میں دن کی پوری روشنی میں بجلی کے پچاسوں قمقمے

بیک وقت روشن تھے۔ بہر حال بڑوں کی مصلحتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں اور ''رموز مملکت'' میں گدائے گوشہ نشیں کے ''دخل وخروش'' کے کوئی معنی ہی نہیں۔

ہال میں کئی صاحبوں سے چلتے پھرتے ملاقات ہوگئی۔ چودھری برہم پرکاش (سابق وزیر اعلیٰ دہلی) ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین وغیرہم، بعض سے صرف سرسری علیک سلیک رہی اور اپنے ہم جنس تو سارے ہال میں ایک قاضی سجاد حسین (فتح پوری والے) نظر آئے جنھیں سند اعزاز فارسی میں اسی سال ملی ہے۔

قیام کُل ڈیڑھ دن رہا۔ دلّی کے سے ''غدار'' شہر میں یہ مدت ہی کیا ہوتی۔ بات کی بات میں کٹ گئی۔ جامعہ ملیہ والوں سے ملنا یکسر رہ گیا، حالانکہ وہاں ایک سے زائد مخلص موجود ہیں۔ ایک مخلص صبح ناشتہ کے وقت دہلی کا خصوصی تحفہ وہاں کی نہاری لے کر آ گئے اور دو مخلصوں نے حسب معمول رخصتی ناشتے ساتھ کیے۔ الجمعیۃ کے اداریے لکھنے والے مولانا فارقلیط قابل زیارت بزرگ ہیں، ان سے ملنے کی سعادت رہی۔ دعوت والے مسلم صاحب بھی جوش و اخلاص میں کسی سے پیچھے نہیں، ان سے اور جماعت اسلامی کے کئی ارکان وعمائد سے ہم کلامی کے ساتھ ہم طعامی کی بھی مسرت حاصل رہی۔ دعوت اور الجمعیۃ کے مسلک میں ظاہری وسیاسی اختلاف جو کچھ بھی ہو۔ اسلامیت اور خدمت ملت کے لحاظ سے دونوں یکساں ہی نظر آئے اور حضرت اکبر کا شعر یاد دلا گئے:

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ اک جنگل میں ہیں اک زو میں ہیں

[مولانا شوکت علی مرحوم اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد میں جو اختلافات تھے انھیں ذہن میں لے آیئے جب شعر کا لطف آئے گا اور اس پر جنگل اور zoo بستان حیوانات کا نقشہ بھی ذرا نظر میں جما لیجیے]

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہیں بلکہ کئی کئی اداروں کے بانی ہونے کے لحاظ سے یہ کہیے کہ ایک ادارۂ عظیم ہیں۔ کم وقت میں اُن کے لیے وقت کمتر ہی نکل سکا پھر بھی جتنا نکلا وہ ضائع نہیں گیا۔ اب کی اُن کے صرف ایک ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی زیارت کا موقع ملا وہ اس کے مستعد کارگزار ناظم سید اوصاف علی کی رہنمائی و سربراہی میں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ مسلمانوں کے کوئی ادارے ایسا ٹھوس کام کرنے والے اور

ماشاء اللہ ایسی سرسبز حالت میں ہیں ہی کہاں۔ جتنی مسرت دیکھ کر ہوئی اس سے بڑھ کر حسرت زیادہ نہ دیکھ سکنے کی رہی:

روئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

وہیں مفتی عتیق الرحمٰن دیوبندی سے بھی لطف مکالمت ومجالست رہا اور ایک ''ظالم'' مالک رام نامی سے بھی:

ہے دلی پوشیدہ اور کافر کھلا

حکیم صاحب ماشاء اللہ مردم شناس بھی ہیں۔ اپنے گرد وپیش رفیقوں، مشیروں، کارکنوں کا انتخاب بھی خوب کر رکھا ہے۔

میزبان قدیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نائب صدر جمہوریہ کا تذکرہ کیا کیا جائے۔ ان کی رفعتیں یوں ہی کیا کم تھیں اور اب تو درجۂ احتمال میں دُنیوی اعتبار سے مرتبہ ومنزلت کی آخری سربلندی بھی ہے۔ چاہا تھا کہ اب کی ان کے وقت عزیز پر بار ذرا سا بھی نہ پڑنے پائے۔ مصروفیت ان کی بالکل ظاہر تھی، لیکن حکم حاضری کا تار پہنچا اور جب دیکھا کہ سن اور مصروفیت میں زیادتی کے ساتھ ماشاء اللہ تواضع، انکسار اور خدا ترسی میں بھی ترقی ہے اور کھانے کی سادگی، لباس کی سادگی اور عام رہن سہن کی سادگی کا وہ عالم ہے کہ باہر والوں کو اس کا یقین بھی مشکل ہی سے آئے گا۔ الوداع کے وقت جو بالکل آخری بات مصافحہ کے لیے میرا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے ان کی زبان سے نکلی تھی وہ یہ تھی کہ ''بس میرے حق میں دعا کیجیے گا''۔ اور قبل اس کے کہ اس فقرہ کو کلمۂ تام سمجھ کر کچھ جواب میں عرض کروں اسی لمحہ جملۂ ناتمام کو یوں تمام کیا ''دعا سے مراد کامیابی ہرگز نہیں ....''۔ میں تڑ سے بول اٹھا کہ 'جی نہیں میں اتنا ناسمجھ کیوں ہوتا، اللہ دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں نصیب کرے اور اگر اس کے علم میں یہ منصب ومرتبہ بھی داخل خیر ہے تو اس پر بھی پہنچا کر ملت کا دل خوش کردے''۔

◆◆◆

باب چہارم

دلّی کے اہل قلم کی کتابوں پر تبصرے

مولانا نے بہت سی کتابوں پر تبصرے، پیش لفظ اور مقدمے لکھے۔ ان کی تنقید سادگی، سلاست، شگفتگی اور تاثر کی حامل ہے۔ وہ اس معاملہ میں کسی خاص دبستان یا اسکول سے وابستہ نہ تھے۔ نثر و نظم دونوں میں بے تکلفی، برجستگی، سلاست اور اخلاق آموزی کے عنصر تلاش کرتے اور انھیں سوقیت اور بازاریت سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا ادب کا تصور صالح ہے اور وہ روایتی اور اخلاقی طرز احساس کے نقاد ہیں جس کا خلاصہ خود انھوں نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے ''اصل شے لٹریچر یا ادب شریف کی تیاری، فراہمی، ترویج و اشاعت ہے۔ ادب شریف سے مراد ہیں نثر و شعر کی وہ ادبی خدمات جنھیں شریف مرد اور شریف بیبیاں، شریف بچے اور بچیاں ہر ملت ہر قوم کی پڑھ سکیں، پڑھا سکیں، سن سکیں، بدمذاقی کو مٹائیے، صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کو پھیلائیے''۔

ڈاکٹر احتشام حسین، سید عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر اعجاز حسین نے ان کی تنقیدی بصیرت اور تاثراتی اسلوب کی تعریف کی ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے ایک ادبی انٹرویو میں انھوں نے ڈاکٹر احتشام حسین صاحب کے تنقید کے متعلق سوال کے جواب میں بڑی صفائی سے کہا'' جی ہاں اب یاران طریقت نے تنقید کو مستقل فن بنالیا ہے، شاخ در شاخ، پیچ در پیچ اور نقادی کو ایک پیشہ بنالیا ہے۔ میں اتنا دماغ کہاں سے

لاؤں، مجھے مرزا ہادی رسوا کا یہ قول کبھی نہیں بھولتا کہ بھئی میں غالب کا عاشق رہا ہوں، مدتوں دیوان غالب سرہانے رکھ کر سویا ہوں لیکن جو شعر پہلی ہی مرتبہ سمجھ میں نہ آیا اسے دوبارہ نہ پڑھا اور یہ سمجھ لیا کہ یہ میرے لیے نہیں۔ شعر پر جب اتنا غور کرنا پڑا تو وہ فلسفہ ہو گیا، شعر کہاں رہا''۔

مولانا نے دلّی کے بہت سے اہل قلم کی مختلف عنوانات کی لکھی کتابوں پر تبصرے کیے ہیں جو اس باب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کی مشہور تصنیف توبۃ النصوح پر ریڈیو نشریہ بھی اس میں شامل ہے۔

ان تبصروں سے ان کے ذوقی، وجدانی اور ادبی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

(1) ''ناکام''

از خواجہ محمد شفیع دہلوی، مٹیا محل دہلی

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ محمد شفیع کا نام اب نہ اردو کے طلبہ کے لیے نامانوس رہا ہے نہ ناظرین صدق کے لیے۔ ناکام ان کا تازہ ترین افادہ قلم ہے سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ، گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ اور ہر صورت میں ادب و انشاء کا ایک گنج شائگان۔ زہرہ ایک مشہور بیسوا ہے اور حسین و حاضر جواب مغنیہ۔ اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑ گیا ہے۔ کاظم ذہانت میں فرد، حاضر جوابی میں استاد، ہر رنگ میں رنگا ہوا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے، لیکن اپنے کو لیے دبے ہوئے نفس کو قابو میں کیے ہوئے۔ اس کا دل اس کے کہے میں وہ خود دل کے کہے میں نہیں، بیسوا نے خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے مگر وہ ظالم ایک بار بھی نہ پھنسا۔ خود شکاری ہی کو شکار کرتا گیا اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت کو چرکے پر چرکے دیتا گیا، لفظ و عبارت میں مے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوان حافظ کا ہونے لگے۔ معنیٰ و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل فشانیاں کہ گمان گلستان سعدی کا گزرنے لگے۔ زبان کے جوہر دیکھنے ہوں تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں ایک میراثی سے ملاحظہ ہو۔ رئیس صاحب اپنی بدآوازی پر نازاں سر محفل چنگھاڑ رہے ہیں، ساری محفل ان کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ۔ چوٹیں کاظم اور میراثی کے درمیان چلنے لگیں۔ ہلکی سی جھلک دیکھتے چلیے۔

میراثی پھیکا پڑ جا رہا تھا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے اتار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا ''سرکار شانوں سے سر نکل رہے ہیں''۔ کاظم نے کہا ''عالیجاہ مجسم موسیقی ہیں''۔ میراثی نے بہت

زور مارا باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا'' سرکار شاہ موسیقی ہیں''۔ وہ حاضر دماغ بولا '' عالی جاہ شہنشاہ موسیقی ہیں لحن داؤدی پائی ہے اس فن کے پیغمبر ہیں''۔ میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا دیے اور بولا'' تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے''۔ کاظم نے عرض کیا'' بیجو باورا کی روح قدم بوسی کے لیے آئی ہے۔ اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سُر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ راگ جلو میں حاضر موسیقی دامن سے وابستہ سرکار راجہ اندر میں موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے۔ اعجاز ہے اعجاز۔ شجر و حجر جھوم رہے ہیں، مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں۔ سُر نہیں نفس عیسوی ہیں''۔ میراثی کچھ بھی ہو میراثی تھا۔ تابڑ توڑ فقرے سن کر تیورا سا گیا، جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کر دیا اور لگا حال کھیلنے۔ یہ راگ کاظم کے بس کا نہ تھا میدان جاتا نظر آیا۔ بازی ہرتی نظر آئی۔ پرواہ رے دماغ۔ فوراً بولا'' سُروں کا زور ہے آگ لگ جائے گی پانی ڈالو، جلدی کرو'' ساتھ ہی برف کے پانی کا بھرا جگ اٹھا بدنصیب میراثی پر ڈال دیا۔ میراثی حال سے بے حال ہو گیا گھگھی بندھ گئی''۔ (48-49)

گنہگار عورت کے دل کی چبھن دیکھنا ہے تو ورق الٹیے۔ بیسوا کے کوٹھے پر کسی نے ایک پُر اثر قصہ مناسب تمہید کے بعد اکبر کا یہ شعر سنایا:

کون خوش بخت ہے زمانہ میں گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر بیسوا کے تاثرات:

'' کان یہ سن رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی اپنے مناظر پیش کر رہی تھی اور میں اس تماشہ میں غرق تھی۔ ایک عجیب لطف تھا، عجب کھٹک، نرالی کاوش تھی، اچھوتی خراش میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں، بانجھ اولاد کے خیال میں سینہ میں ایک چیز تھی جو کچھ مانگ رہی تھی پہلو میں ایک خلا تھا جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رواں۔ میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا۔ آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے کے لیے، ماں بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سلا دیا گیا تھا۔ آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب دریا اور غلط فضا

کے انبار میں دبا دیا گیا تھا، رنڈی کا جامہ چاک کر کے وہ عورت برآمد ہونے کو
تھی جو کھونے کا پانا سمجھتی ہے۔ وہ عورت جو اپنا خون چسا کر نسل انسانی کو پالتی
ہے۔ عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے۔ عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔
میں آدم وحوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج میں فطرت ہی فطرت تھی ماحول
سے مبرّ افضا سے بالاتر''۔

غرض کتاب کیا ہے ایک عجوبہ صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی، چہرہ پر شوخی وظرافت کی نقاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان، بیسویں صدی کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جانے کے قابل، افسانہ نام کا ''ناکام'' لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

(صدق نمبر 40 جلد 7، 23 فروری 1942

(2) ''چند افسانے''

از خواجہ محمد شفیع دہلوی، اردو مجلس، مٹیا محل، دہلی

دہلی کے سحر طرز انشا پرداز اہل زبان خواجہ شفیع سلمہٗ اب اس منزل سے گزر چکے ہیں کہ ان کی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو۔ ان کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے۔ مضمون کے پاکیزہ، شستہ ولطیف ہونے کی ضمانت، زبان کی صحت، سلاست، شیرینی کی دستاویز۔

مجموعہ جی میں آتا ہے کہ اسے گلدستہ کے نام سے پکاریے۔ اس میں دو نظمیں ہیں اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے۔ پر بہار جیسے موسم گل دلآویز جیسے نغمہ بلبل۔ افسانوں کے پلاٹ کسی مسجد وخانقاہ کے نہیں، وہی بازاروں، ہوٹلوں، کالج کے لڑکوں اور بیسواؤں کے کوٹھوں کے۔ لیکن مجال کیا جو دامن خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ فحش وابتذال کا پڑ جائے۔ خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے، گلاس پر گلاس چھلکائیں گے۔ بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے۔ اور لیبل دیکھ کر جن شیشوں پر جانی واکر (ولایتی شراب کے ایک مشہور وقدیم کارخانے کا نام ہے) کے قدحوں کا گمان تھا وہ شراب طہور کے جام نکلے۔ زبان خاص الخاص دہلی کی مستند اور ٹکسالی اور ادب کا مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب عوام پسند طبقہ میں شامل ہونے کے قابل

نہیں۔ اچھی خاصی استعداد اور اردو کے نسبتاً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کوئی خاص بات شاید نہ محسوس کر سکیں۔

(صدق نمبر 42 جلد 8، مؤرخہ 8 مارچ 1943)

(3) ''خلاصہ فسانۂ آزاد''

از ابوتمیم فرید آبادی کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی، قیمت تین روپیہ

سرشار کی فسانۂ آزاد اردو ادب و افسانہ کی ایک مشہور کتاب ہے، لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا مرقع۔ اب ذرا پرانی البتہ ہوگئی ہے۔ 75 سال کا فاصلہ بڑا ہوا، اور پھر ضخیم اتنی کہ بیسویں صدی کے وسط میں آدمی اس دفتر کو ختم کرنے کی فرصت کہاں سے لائے۔ سید ابوتمیم فرید آبادی بھی کمال کے مرد ظریف و صاحب ذوق نکلے کہ اس زمانے میں اس دریا کو کوزے میں بند کرنے بیٹھے اور جو سوچتے تھے اسے کر دکھایا یعنی بڑی تقطیع کے کئی ہزار صفحوں کی ضخامت کو چھوٹی تقطیع کے تین سو صفحوں ہی کے اندر سمو دیا۔ اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے نہ کوئی حرف بڑھایا نہ کوئی لفظ بدلا۔ بس اتنا کیا کہ جابجا سے عبارتیں چھانٹتے گئے اور جتنا حصہ حشو مکررات کا تھا اصل حصہ میں خلل انداز اسے یک قلم نظری کرتے گئے گویا جہاں جہاں جھول تھا اسے دور کر کے چست کر دیا اور اب کتاب کو بیسویں صدی کے کم فرصت جلد باز ناظرین کے ہاتھ میں جانے کے قابل بنا دیا۔ کتاب پر اگر ایک مقدمہ کا اضافہ ہو جاتا اور جو محاورے اب پرانے ہو گئے ہیں ان پر جابجا حاشیے دے دیے جاتے تو کتاب میں اور بھی چار چاند لگ جاتے۔

(صدق جدید نمبر 29 جلد 4، مؤرخہ 18 جون 1954)

(4) ''میرے زمانہ کی دہلی'': (جلد اول)

از ملا واحدی صاحب، 322 صفحات، مجلد، قیمت ساڑھے تین روپیہ
دفتر نظام المشائخ، جیکب لائنز، کراچی-3، پاکستان۔

یہ کہنا چاہیے کہ دہلی مرحوم کا مرثیہ ہے۔ ایک خاص الخاص دہلوی کی زبان سے۔ ملا واحدی صاحب کی ادبیت کی جان، ان کا اخلاص ہے۔ ان کا مقصود یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کبھی دوسروں کو بھی سنانا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے وہ باتیں اپنے آپ سے کر رہے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ

آواز ذرا بلند ہے اور آس پاس والے اسے اتفاق سے سن سنا لیتے ہیں۔ ان کی مرثیت ایسی نہیں کہ وہ کبھی چیخ کر روئیں وہ صرف چپکے چپکے آنسو بہانا جانتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ ہلکی سی سسکی بھی بھر لیتے ہیں۔

اکبر مرحوم نے ایسے شعر کی تعریف یہی کی تھی کہ دوسروں کو سننے سنانے کے لیے نہیں شاعر خود اپنے لیے کہتا ہے:

نہ ان کے لیے ہیں نہ اُن کے لیے
نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لیے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز
کہ میں شعر کہتا ہوں۔ اپنے لیے

کچھ ایسا ہی رنگ ملا واحدی صاحب کی نثر کا ہے۔ وہ دوسروں کی مدح و تحسین سے بے نیاز، اپنے ہی اندرونی تقاضوں سے مضطر و مجبور ہو کر قلم اٹھاتے ہیں اور جو کچھ اندر ہوتا ہے اسے باہر لے آتے ہیں۔

دہلی والوں سے ان کی مراد خاص دہلی کے باشندے ہی نہیں بلکہ باہر کے بھی وہ لوگ مراد ہیں جو ان کے زمانے میں دہلی میں مقیم رہے اور اس طرح موضوع کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا ہے۔ مولانا محمد علیؒ کا ذکر ذرا تفصیل سے آ گیا ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ کا اجمالاً۔ بعض ناموں کے تذکرہ میں ان کا حافظہ انھیں دھوکا دے گیا ہے۔ خصوصاً سید جالب مرحوم کے سلسلے میں ص:313 ص:314 پر لیکن اس سے نفس مضمون پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

(صدق جدید، نمبر 45، جلد 8، 10 اکتوبر 1958)

(5) ''انجمن ترقی اردو کی کہانی''

از غلام ربانی صاحب، انجمن ترقی اردو، دہلی

موضوع نام سے ظاہر ہے۔ انجمن کی پچھلی تاریخ موجودہ کام اور آئندہ کی تجویزوں کا ایک دلچسپ اور جامع تذکرہ۔ مصنف صاحب کا تعلق دکن کے محکمہ آثار قدیمہ سے ہے لیکن قلم کو ماشاء اللہ قدرت آثار قدیمہ و جدیدہ دونوں پر یکساں ہے۔

(صدق نمبر 3، جلد 6، مؤرخہ 2 مئی 1940)

(6) ''ہم اور وہ''

ازخواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، مکتبہ جامعہ، دہلی

قدیم وجدید کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی، پھر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے۔ مدت سے کہا یہ جارہا تھا کہ دلّی اب دلّی والوں سے خالی ہوگئی اور زبان دانی اس خطہ سے رخصت ہوگئی۔ 'ہم اور وہ' نے ثابت کردیا کہ دلّی میں دلّی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلّی کی زبان اب بھی ماشاء اللہ اسی آن بان سے زندہ قائم و پابند ہے درخشاں و تابندہ ہے۔ مصنف نے ایک اچھوتے طریقے پر قدیم وجدید کی بحث کو اٹھایا ہے اور محاکمہ کا حق ادا کردیا ہے۔ نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رخ کہیں کہیں غلو ومبالغہ کی جانب جھک گیا ہو لیکن بہ حیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے سچی، کھری، سیدھی اور خدالگتی اور حسن زبان و بیان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ ہے۔ فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی اور بلاغت قدم قدم پر نثار ہوتی جاتی ہے۔ حسن انشاء کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں بہت بہت برکت، ان کے قلم کو بہت بہت قوت عطا کرے کہ گلشن اردو کو ایسی ہی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی۔

(صدق نمبر 25، جلد 6، مؤرخہ 28 اکتوبر 1940)

(7) ''دلّی کا سنبھالا''

ازخواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، مکتبہ جامعہ، دہلی

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے دلّی والوں (کچھ دلّی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں، چلتی پھرتی، بولتی چالتی نظر آرہی ہیں اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ تو ہیں، عالم وفاضل بھی، رند اور اوباش بھی، زاہد و مرتاض بھی اور شوخ وطرار بھی۔ ایک طرف شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ اسماعیل شہید، سرسید، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں تو دوسری طرف فلاں گویے اور فلاں ستار نواز اور فلاں بی صاحبہ۔ مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں، اس لیے ایسی فروگذاشتوں کو نظر انداز کیجیے کہ مولانا

اسماعیل شہید نے علم جہاد حکومت برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا۔ (ص ۱۱۱) مصنف کا مقصود اپنی زبان دانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دلّی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب رہے ہیں گویا امتحان کے پرچے میں سو نمبروں میں پورے سو پالیے ہوں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حسن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اہل قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہوں وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت پر بھی قادر ہوں، دونوں کا اجتماع اس وقت اردو لکھنے والوں میں تو خال ہی خال نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ان مستثنیٰ مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوب بیان کی دلکشی۔ دلکشی نہیں دلبری اس پر قیامت۔ ممکن نہیں کہیں کوئی صفحہ کھل جائے اور پھر ختم کیے بغیر آپ کو چھوڑنے کا جی چاہے۔ ایک دو منظروں پر نگاہ اچٹتی ہی سہی ڈالتے چلیے۔ ''اہل دربار مؤدب کھڑے ہو گئے۔ دلّی ماتا نے تعظیم دی۔ یہ کون تین بھائی آرہے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ طبقات لیے ساتھ ساتھ ہیں۔ نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک، مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز کے مؤلف، مولانا شاہ رفیع الدین صاحب، بھاٹ نے عرض کی:

خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے تست

رفعت علم تالب فرش لینے آئی صف علماء میں مرتبہ پر لے جا بٹھایا۔ مولوی میاں نذیر حسین صاحب اپنے معتقدوں کے ہمراہ دفاتر احادیث مقدسہ لیے تشریف لائے۔ اہل دربار نے تعظیم دی، دلی ماتا نے بہ نظر عنایت دیکھا اور کہا سر پر نور شہادت پرتو فگن ہے۔ ان کا مستقبل بناؤ۔ منجم قدرت نے دلی ماتا کی پیشین گوئی کی شہادت دی۔ علم و تقدس کی اس شہ نشینی سے اتر کر اب ضلع جگت کے میدان میں آئیے۔

> ''روز محفل آراستہ ہوتی ہے شہر بھر کا تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتا ہے۔ اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لیے آتے ہیں۔ استاد سے سب چھوٹ ہوتی ہے جو منہ آتا ہے منہ کی کھاتا ہے۔ ظالم ایک نہ ایک ایسا فقرہ چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منہ زور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے، جواب نہیں بن پڑتا۔ اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا ہے۔ استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے۔ دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی ویسے منہ بھی دکھانا پھر کبھی آنا۔ جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے اس کا پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ

دکھائے۔ استاد ایسا منھ توڑ دندان شکن فقرہ کہتا ہے کہ منھ پھیر دیتا ہے''۔

زبان ادب کے معیار سے ایسی کتاب مدت کے بعد دیکھنے میں آئی اور متفرق معلومات کے لحاظ سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

(صدق نمبر 46، جلد 6، مؤرخہ 12 اپریل 1941)

(8) ''مادر ہمدرد''

از خواجہ حسن نظامی، امیر خسرو اردو لائبریری، دہلی

دہلی کے ''ترک ہزار شیوہ'' خواجہ حسن نظامی مدت کے بعد پھر اہل قلم کی بزم کاغذی میں جلوہ نما ہوئے ہیں۔ انداز رفتار میں وہی سبک گامی وہی نازک خرامی جو ہمیشہ سے ملتی۔

نام کتاب میں ترکیب توصیفی یعنی اضافی ہے۔ مادر ہمدرد صفت موصوف نہیں مضاف مضاف الیہ ہیں۔ ہمدرد مہربان و مشفق کے معنی میں نہیں اسم ذات ہے اور اس سے مراد دہلی کا ایک مشہور مرحوم روزنامہ نہیں بلکہ شہر کا ایک زندہ اور زندگی بخش دواخانہ ہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب کو مبارک ہو کہ ان کے لق و دق اور ہر اشتہار و تعارف سے بے نیاز کارخانے کو بے کدو کاوش نقیب اور منادی ایسا زبردست ہاتھ میں آ گیا۔

کتاب کا موضوع یہ بتایا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ اور روس کا کلچر خود غرضی پر مبنی ہے، اس کے مقابلے میں ایشیا اور اسلام کے کلچر میں مادری تربیت کی بڑی اہمیت ہے اور اس میں ہر طرح کا سکون روح و راحت قلب ہے لیکن کتاب کے ورق ورق الٹتے چلے جائیے موضوع کی جھلک دیکھنی بھی نصیب نہ ہوگی بشرطیکہ کتاب کی دلچسپیوں میں گم ہو کر ذہن میں موضوع کی یاد باقی رہ جائے۔

کتاب کے اندر بیسیوں نہیں پچاسوں بلکہ سیکڑوں شخصیتوں کا ذکر ہے کسی کا سطر دو سطر میں اور کسی کا کئی کئی صفحوں میں اور پھر اس میں ماضی بھی ہے اور حال بھی، مدح بھی ہے اور قدح بھی، طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔ شخصیتیں بھی ہر درجہ و مرتبہ کی اور ہر ذہنیت و نوعیت کی۔ بادشاہ اور رعایا انگریز اور ہندوستانی، ہندو و مسلمان، رند و زاہد، امیر و غریب، شاعر اور گویے میں سے کوئی بھی چھوٹنے نہیں پایا۔ پھر محض شخصیتوں ہی پر بس نہیں بخشیں بھی زمین و آسمان کی۔ ابھی ذکر جمہوریت کا تھا اور موضوع داڑھی کا چھڑ گیا۔ ریویو نگار غریب حیران کہ اس ساری رنگارنگی اور بوقلمونی کو

سمیٹ کر کتاب کی کون سی صنف قرار دی جائے اور اسے کس فن کے تحت لایا جائے۔

درویشوں میں ایک قسم سیلانیوں کی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کا قلم بھی ایک آزاد درویش کا قلم ہے لیکن ہر بے ترتیبی ژولیدگی کے مرادف نہیں اور بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی، نری شاعری نہیں واقعہ بیانی بھی ہے ایسے ہی موقعوں کے لیے۔ کتاب دلچسپ شروع سے آخر تک ہے۔ بعض دفعہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ تذکرہ وسوانح عمری کے بجائے کسی افسانہ، پُراسرار افسانہ کے صفحے سامنے کھلے ہیں۔ سب سے حیرت انگیز اور مؤثر حصہ بنارس کی ایک طوائف کی سرگزشت ہے صفحہ 53 تا59۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر صوفی عنایت خاں مرحوم کا تذکرہ صفحہ 137 تا139۔

(صدق نمبر 45، جلد 15، مؤرخہ 31 مارچ 1950)

(9) ''تاریخ انجمن ترقی اردو''

از سید ہاشمی فرید آبادی صاحب

310 صفحہ مجلد قیمت ساڑھے تین روپیہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ کراچی

یہ پندرہ سالہ تاریخ 1903 سے 1953 تک اس انجمن ترقی اردو کے ہے جو کبھی ''آل انڈیا'' تھی اور اب ''آل پاکستان'' ہے۔ یہ پنجاہ سالہ مفصل روئیداد انجمن یوں بھی دلچسپ جاذب توجہ ہی ہوتی، پھر جب کہ کہانی کہنے والا سید ہاشمی فرید آبادی جیسا مشاق داستان گو ہو۔ کیا اچھا ہوتا کہ سرورق پر کتاب کا دوسرا اور عام فہم نام یوں درج کر دیا جاتا'' انجمن ترقی اردو کی خزاں و بہار کی کہانی، فرید آبادی کی زبانی''۔

کتاب آٹھ بابوں میں تقسیم ہے، باب اول تاسیس انجمن پر ہے جب انجمن کانفرنس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے مولانا شبلی مرحوم اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کے سپرد تھی۔ باب دوم مولوی عبدالحق صاحب کے دور نظامت اور انجمن کی کارکردگی پر ہے۔ باب سوم میں مولوی صاحب کی سرکاری خدمت سے پنشن پانے اور انجمن کے دکن سے دہلی منتقل ہوآنے پر ہے۔ اور اسی ضمن میں ودیا مندر اسکیم وغیرہ کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ باب چہارم انجمن کے ابتدائی دور دہلی پر ہے۔ باب پنجم انجمن کے نو سالہ دور دہلی پر ہے۔ باب ششم خود مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے، ہندوستان کے فسادات اور انجمن کی ہجرت پاکستان پر ہے اور قدرتاً اس باب کا مطالعہ بڑا صبر آزما و دردناک ہے۔ آخر کے دو باب مع ضمیموں کے انجمن کے دور پاکستان پر ہیں۔ یہ کتاب ساری وہی ہے جو انجمن

کے رسالہ اردو کے دونمبروں (جولائی و اکتوبر 1953) میں بھی شائع ہوچکی ہے۔

کتاب کے اکثر حصوں کا مطالعہ بڑا ہمت افزا اور ولولہ خیز ہے لیکن اس طرح بعض دوسرے حصہ میں افسردگی اور اداسی پیدا کردینے کے لحاظ سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔

(صدق جدید نمبر 16، جلد 4، 19 مارچ 1954)

(10) ''خمسہ کیفی''

از پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، انجمن ترقی اردو، دہلی

ہندو ادیبوں اور زبان دانوں میں اب پنڈت دتا تریہ کیفی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پیش نظر رسالہ ان کی دو نظموں اور تین نثروں کا مجموعہ ہے جو سب کے سب زبان ہی سے متعلق ہیں ان میں سے دو مضمون ایک ''اردو ہماری زبان'' دوسرا ''اردو لسانیات'' خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ پہلا وہ لکچر ہے جو کوئی ڈیڑھ دو سال ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہال میں بہ سلسلہ اردو کانفرنس دیا گیا تھا۔ دوسرا وہ توسیعی لکچر ہے جو مصنف نے کئی سال ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں دیا تھا۔ یہ دونوں لکچر خطیبانہ نہیں فاضلانہ انداز کے ہیں اور ان میں بہت سی کام کی باتیں ادب اردو، لسانیات اردو کے طلبہ کو مل جائیں گی۔ تیسرا لکچر ''ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات'' کے عنوان سے پٹنہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا وہ بھی اپنے رنگ میں اچھا خاصا ہے۔ کتاب ان لوگوں کے مقابلے میں ایک پورا اور مسکت جواب ہے جو اردو کو مسلمانوں کی مخصوص جائیداد سمجھ رہے ہیں۔ رسالہ کا ایک صفحہ انھیں بتادے گا کہ ایک پیدائشی اور پشتہا پشت کا ہندو ''ہندوستانی'' پر نہیں اردو پر ہندی آمیز اردو پر نہیں، اچھی خاصی دقیق اور مغلق، مفرس و معرب اردو پر کس بے تکلفی سے قادر ہے۔

سرورق پر اگر مصنف کا نام نہ ہو تو یہی پتہ چلنا دشوار ہے کہ عبارت کسی مولوی قسم کے ادیب کی نہیں ہے۔ اردو کی پچھلی تاریخ میں بے شبہ یہ مثال کوئی انوکھی نہیں لیکن نسیم اور سرشار، سرور اور چکبست، نظر اور برق کا دور ختم ہوجانے کے بعد اب ایسی مثالیں تو خال ہی خال نظر آئیں گی۔ چار روپیہ کی قیمت میں ایسا مجموعہ ہاتھ آجانا بالکل مفت ہے۔

(صدق نمبر 1، جلد نمبر 6، مورخہ 6 مئی 1940)

(11) ''محمد حسین آزاد''

از جہاں بانو بیگم صاحبہ، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد

آزاد کی سوانح اور کلام، نثر و نظم پر تبصرہ دکن کی ایک خاتون کے قلم سے نکلا ہے۔ اصل مقالہ ایم اے کے امتحان کے لیے تیار کیا گیا تھا، وہی ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ طالب علمانہ کوشش معیار سے اچھا خاصا ہے لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے پیش کرنے میر مزید اہتمام کی ضرورت تھی۔ طنز و تعریض اور اپنے پیش رووں کی تحقیر مصنفہ کے 'عرض حال' سے شروع ہوگئی ہے اور ادب و سوانح کی کتاب جا بجا 'کتاب الجدل' بن گئی ہے۔ غلو کی مثالیں بھی کثرت سے ملیں گی۔ استدلات اور بیانات میں نمایاں خامیاں ہیں مثلاً پہلے تو مولانا شبلی کے ایک خانگی مکتوب سے یہ فقرہ کھود کر نکالا گیا ہے کہ '' آزاد تحقیق کے میدان کا مرد نہیں'' اور پھر اس کی تردید میں سند پیش کی گئی ہے۔ حالی کے مرثیہ آزاد سے (ص:65) یا مثلاً آب حیات کی زبان کی داد دینے کے موقع پر حالی، سرسید، نذیر احمد کے علاوہ تقابل و موازنہ میں اکبر کا نام بھی خواہ مخواہ لے آیا گیا ہے۔ ص:73۔ زبان بھی نظر ثانی کے بعد زیادہ بہتر بنائی جا سکتی تھی۔ نو مشق اہل قلم کی ہمت افزائی یقیناً بہت ضروری ہے لیکن اسے بھی حدود مناسب کے اندر رہنا چاہیے۔ مصنفہ میں صلاحیت اچھی ہے امید ہے کہ تجربہ و مشق کی پختگی کے ساتھ خیالات میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

(صدق نمبر 11، جلد نمبر 6، مؤرخہ 23 جولائی 1940)

(12) شرح درد

از خواجہ محمد شفیع دہلوی، مٹیا محل، دہلی

خواجہ محمد شفیع دہلی کے رہنے والے ہیں اور نئی دہلی کے دور میں پرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے۔ خواجہ میر دردؒ کے اردو کلام کی یہ شرح شرح درد اپنے رنگ میں فرد خود انہی کے قلم سے ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے، بلاغت قدم چومتی جاتی ہے۔ دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے۔ جی ہاں کھجور کے درخت سے، ان رسیلی شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لال لال کھجوروں کا مزہ تو بعد میں چکھیے گا، ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلیے:

> "صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت ہر رگ و ریشہ کا کام۔ پھول پتی کار آمد پھل غذا، گٹھلی، دوا، جڑیں مضبوط، بلند و بالا، استوار۔ سموم تھپیڑوں سے جھک جائے، دم کے دم میں خود سیدھا، مرکز سے جنبش نہیں، اپنی بقا کے لیے کم از کم کا طالب۔ دوسروں کی بقا کے لیے زیادہ سے زیادہ حیات بخش۔ فروعات سے معرّیٰ۔ چوٹی پر ایک گتھا ہوا گلدستہ پھول پھل سب ایک جگہ، یکجہتی اور سلوک کا نمونہ سایہ دور تک پھینکے۔ جگہ کم گھیرے۔ برگ و بار کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلندی دے جائے۔ خود سپرد خاک ہو کھاد بن جائے، آنے والوں کے لیے بلند تر مقام کی بنا ہے"۔

بارہ برس کی اس گنتی میں ماہ ربیع الاول کی بارہویں کی بہار، بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار، نئی تشبیب اور نئی گریز۔ مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے۔

> "جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا اسی دیس سے ایک دین چلا۔ کار آمد فطری اصول کا حامل قوی الاساس، وسیع النظر، راستی و راست بازی کا عامل، دب دب کر ابھرنے والا، مرکز سے نہ ہلنے والا، آسانیاں اور فراخیاں بہم پہنچانے والا لیکن تسلیم و رضا کا طلب گار۔ فرقہ بندی سے غیر متاثر، وحدت کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم و رواج کی پنہائیوں سے معرّیٰ، ہلکا پھلکا دو ررس، ترقی کا راستہ دکھانے والا، فنا میں بقا کا سبق دینے والا یہ وہ مذہب تھا جو رسول اللہؐ لے کر آئے تھے"۔

زبان کی ان لطافتوں، ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اردو کے بارہ پتھر سے باہر ہے۔

(صدق نمبر 28، جلد 17، نومبر 1941)

(13) "مرزا غالب کی شاعری"

از مرزا محمد عسکری صاحب، صدق بک ڈپو، لکھنؤ۔

مرزا صاحب کا ایک فاضلانہ مقالہ جو 1925 میں مسلم اکاڈمی، لکھنؤ میں پڑھا گیا تھا، بیس

سال بعد اب کتابی صورت میں میں شائع ہوا ہے۔ بظاہر صرف ایک مقالہ ہے لیکن اس کے اندر غالب اور متعلقات غالب پر بہت کچھ آ گیا ہے۔ غالب کا ماحول، غالب کی شاعری کی نشو ونما، غالب کا نسب، غالب کا مذہب، یہ سب مباحث اس میں سموئے ہوئے ملیں گے خصوصاً غالب کے مذہب پر گفتگو بسط و تفصیل سے ہے۔ مقالہ شیدائیانِ غالب کے کام کی چیز ہے اور اس کا بہترین ترمختصر حصہ وہ ہے جس میں اشعار غالب کی شرح و ترجمانی کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل لکھنوی اصلاً اسی میدان کے مرد ہیں۔

صفحہ تین پر فی الذہن الشاعر میں ذہن سے قبل ''ال'' زائد چھپ گیا ہے۔

(صدق نمبر 33، جلد 11، مؤرخہ 4 ستمبر 1954)

(14) ''ادبی تبصرے''

از بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، دانش محل لکھنؤ

جس کی عمر خود تبصروں میں گزر چکی ہے اس کے تبصروں پر تبصرہ کرنا کسی بڑے مبصر ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ ایسے ویسے نظر باز کا یہاں گزر نہیں۔ دانش محل والے دانش کے ساتھ بینش کے پتلے بھی۔ خوب سوجھ گئی کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو اکٹھا کر کے ایک مالا میں پرو دیا جائے۔

یہ تبصرے تعداد میں پندرہ ہیں اور زیر تبصرہ کتابوں میں نثر کے حدیقے اور گلستاں بھی ہیں اور نظم کے گلدستے و بوستاں بھی اور جن شخصیتوں کی جھلکیوں سے یہ بزم ادب آراستہ کی گئی ہے ان میں ثقافت اور سنجیدگی کے ایسے ایسے بھاری بھر کم نمائندے بھی ہیں جیسے مولانا حالی، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی اور رنگینی و نسائیت کے ایسے ہلکے پھلکے نمونے بھی جیسے واجد علی شاہ اور جان صاحب لکھنوی۔ بیچ بیچ میں چلتے پھرتے مہدی گورکھپوری کے ادبِ لطیف اور ن۔ م۔ راشد کی ترقی پسندی کے۔

کتاب شروع ہوتی ہے جوش ملیح آبادی کے ''روح ادب'' پر تبصرہ سے اور ختم ہوتی ہے انہی جوش صاحب کے ''آیات ونغمات'' کے تبصرے پر۔ گویا بائے بسم اللہ بھی جوش اور تائے تمت بھی جوش۔ اچھا ہوا کہ جوش صاحب کی نومشقی اور پختہ کاری دونوں کے مرقع ایک ہی مجموعے میں آ گئے۔

ڈاکٹر صاحب باتیں بڑے پتے کی کہہ جاتے ہیں اور کہیں کہیں بڑے مزے کی بھی۔ زبان

میں بہت لوچ نہ سہی، نظر میں گہرائی تو ہے اور چاہے آپ ہر جگہ ان کی رائے کا ساتھ نہ دے سکیں لیکن یہ تو بہر حال مانی ہوئی بات ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں صفائی، بے تکلفی اور صحت زبان کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ لکھنوی ٹھسّے اور دہلوی چونچلے کے ساتھ نہیں بڑے مردانہ دھڑلے سے کہہ گزرتے ہیں اور پڑھنے والا جب کتاب بند کرتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ پڑھنے میں جو وقت لگا وہ ضائع نہیں ہونے پایا۔ کھویا کچھ نہیں اور سیکھ لیا بہت کچھ۔

البتہ ناشر صاحب اتنے سستے نہیں چھوٹ سکتے اور ایک نہیں دہرے دہرے جرم کے مجرم ہیں۔ پہلا غضب یہ کیا کہ کسی مضمون پر تاریخ تک نہیں ڈالی۔ کچھ نہیں پتہ چل سکتا کہ کون تبصرہ کب لکھا گیا اور پہلے اور آخری تبصرے کے درمیان زمانہ کا فاصلہ کتنا ہے۔ تبصرہ نگار اپنی ذاتی واقفیت سے لکھتا ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم پندرہ سال کی مدت حائل ہے۔ پہلا تبصرہ 1930 یا 1931 کا ہے اور آخری تبصرہ 1945 یا 1946۔ اس پندرہ سال کی مشاقی نے تو مولوی عبدالحق صاحب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہوگا اور پھر دوسرا غضب یہ کہ کسی تبصرے کے ماٰخذ کا حوالہ کہیں بھی نہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہ یہ تبصرے کب نکلے، کس رسالہ میں نکلے، یہاں بھی ذاتی واقفیت کی بنا پر عرض ہے کہ تبصرے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں نکلتے رہے۔

جو ناشر کب اور کہاں کے اہم ترین سوالات کی طرف سے اتنا بے پروا ہو اس سے اس کی شکایت ہی کیا کہ کتاب پر دیباچہ یا مقدمہ کو ایک سطر میں نہیں اردو کے مشہور مقدمہ نویس (مقدمات کی کثرت قریب تھا کہ مقدمہ نویس کو مقدمہ باز میں تبدیل کردے) کی کتاب بغیر کسی مقدمہ کے۔

(صدق نمبر 43، جلد 13، مؤرخہ 12 مارچ 1947)

(15) ’’دلّی کا دبستان شاعری‘‘

از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، انجمن ترقی اردو، کراچی

وصل کی رات کوئی بڑھانا دیکھے!

شاعر نے مصرعہ جس موقع کے لیے کہا ظاہر ہے لیکن ہمارے ہاں ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقانہ مقالہ نویسی کا جو معیار قائم ہوگیا ہے اس سے بھی مصرعہ کا تعلق کچھ بہت دور کا نہیں۔ طوالت، دراز نفسی، بات میں بات پیدا کرنا کچھ ان مقالوں کا شعار خصوصی سا ہوگیا ہے۔ لکھنؤ کا دبستان

شاعری تو 26x20 تقطیع کے چھ سو صفحات سے اوپر میں چھپی تھی، یہ دلّی کا دبستان شاعری اس سے تو بہت کم صفحات کی ہے پھر بھی اچھی خاصی طویل ہے۔ یہ مقالہ نویس حضرات شاید حجم بڑھانے کے خیال سے بلاضرورت دوسرے ادیبوں کی رائیں نقل کرتے اور پھر خواہ مخواہ اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں اور پھر جو بات ایک فقرہ میں سیدھے اور سادہ طور پر کہی جاسکتی ہے اسے پیچ دار بنا کر اور گھوم گھما کر ایک صفحہ میں ادا کرنا کوئی بڑا ہنر سمجھتے ہیں۔

ہاشمی صاحب کی دبستان اس عام مشترک عیب سے تو خالی نہیں لیکن اور حیثیتوں سے بہت غنیمت بلکہ بعض حیثیتوں سے غنیمت ہی نہیں قابل قدر ہے۔ کتاب سات بابوں میں تقسیم ہے۔ پہلا باب صفحہ 22 تک دہلی کے سیاسی اور معاشی حالات پر ہے، اس میں 1707 (دور بہادر شاہ اول) سے ختم 1857 دور بہادر شاہ ثانی تک کی گویا تمدنی تاریخ قائم ہے۔ یہ پس منظر قائم کرنے کے بعد دو بابوں میں بیان دہلی میں شعروشاعری کا چرچا صفحہ 36 اور دہلی میں شاعری کا موضوع اور معیار صفحہ 51 پر ہے ان حصوں میں کہنا چاہیے کہ دہلی کا ادبی وشاعرانہ ماحول آگیا ہے۔ چوتھے باب دہلی میں شاعری تا صفحہ 105 میں دہلی کی شاعری کے مختلف دور قائم کیے گئے ہیں اور پانچویں باب دہلی کے شعراء تا صفحہ 272 میں دہلی کے مشہور شاعروں کے تذکرے اور ان کے کلام پر تبصرے ہیں۔ چھٹا باب دہلویت کیا ہے تا 352 کتاب کا اہم ترین باب اور گویا مغز کتاب ہے، سوال جو مصنف نے عنوان میں کیا تھا اس کا مختصر جواب بھی یہیں خود مصنف کی زبان سے سن لیجیے۔ ”دہلویت میرے نزدیک خاص افتادِ ذہنی یا مزاج شعری کا نام ہے جس کا ظہور مخصوص تمدنی وتہذیبی اثرات کی وجہ سے ہوا۔ دہلی کا شاعر غم روزگار کا ستایا ہوا اور غم عشق کا مارا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک آگئی ہے۔ سیاسی حالات نے اس کو بنایا۔ تصوف کی میراث نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔ اس نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولیں۔ اس کے سطحی پہلو نے عشق پرستی کو عام کیا مگر اچھے شعراء نے اس میں اندر ڈوب کر عشق حقیقی کے منازل طے کیے“۔

ساتواں باب دہلی کی زبان اور شاعروں کی عہد بہ عہد اصلاح زبان پر ہے اور اس ضمن میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے اختلافات، نحو و بلاغت ومحاورہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب اس میں شبہ نہیں کہ بڑی محنت اور بڑے ہی وسیع مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ البتہ معاصرین یا بعض قریبی متقدمین کی رایوں سے تعرض بلاضرورت ہے۔ یہ تعرض کبھی تو تائید کے

لیے ہوتا ہے اور اکثر تردید کے لیے۔ یہ مرض تحقیقی مقالوں میں عام ہے۔ غنیمت ہے کہ اس کتاب میں ایسی بھرتی کی عبارتیں نسبتاً کم ہیں۔ ہاشمی صاحب کی اپنی رائیں عموماً جچی تلی اور ذوق سلیم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں لیکن یہ بار بار فراق گورکھپوری کا نام لانا ذرا کھل گیا۔ جیسے فراق صاحب بھی کوئی امام فن اور محققین سخن سنج حسرت موہانی یا نظم طباطبائی یا برج موہن ناتھ کیفی کی ٹکر کے ہیں۔

ہاشمی صاحب زبان عموماً صحیح اور صاف لکھتے ہیں کہیں کہیں چوک بھی گئے ہیں مثلاً:

(1) ''دہلی والوں نے اسے اپنی اصلی طبیعت کے مطابق نہیں پایا'' صفحہ 68 موقع'' نہ پایا تھا'' کا تھا۔

(2) ''مومن معاملہ بندی اختیار کیے ہوئے ہیں اور غالب مختلف بہروپ بھر رہے ہیں کہیں رند ہیں کہیں ولی''۔ صفحہ 98۔ بہروپ بھرنا محل ذم پر آتا ہے اور سیاق مصنف کا یہ مقصود ذرا بھی نہیں بتلا رہا ہے۔

(3) بادشاہ کو بھی وہی رنگ پسند تھا اس نے اس لیے ذوق کو ملک الشعراء کا خطاب دے رکھا تھا''۔ صفحہ 94۔ دے رکھا تھا اس پر لکھنویت سے کہیں زیادہ پنجابیت کا ترجمان ہے۔

(4) ان کا گلزار کہیں کہیں رنگین تو ہے لیکن خوشبو کہیں نہیں''۔ صفحہ 95۔ خوشبو اس معنی میں فارسی میں بے شک آتا ہے اور اب اردو والوں نے صفت کے لیے خوشبودار گڑھ لیا ہے اور خوشبو کو بو اور بدبو کی طرح اسمیت کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

کتاب عرق ریزی کے ساتھ نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی بڑی خوش ذوقی کے ساتھ بھی لکھی گئی ہے اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے خوب کیا جو اسے اپنی فہرست مطبوعات میں جگہ دے دی۔ اس کا شمار انجمن کی قابل قدر کتابوں میں رہے گا لیکن انجمن کے عملہ نے طبع کتاب کی نگرانی میں اپنی بے توجہی کا ثبوت تکلیف دہ حد تک دیا ہے۔ اندرونی اور بیرونی سرورق پر لفظ قیمت درج کر کے آگے جگہ دونوں صفحوں پر سادہ چھوڑ دی۔ اسی طرح فہرست ابواب کے نیچے بجز ابتدائی تین بابوں کے اور کسی باب کے صفحے درج ہی نہیں کیے۔ پڑھنے والے کی طبیعت کا جھنجھلانا ایسے موقع پر بالکل قدرتی ہے۔

(صدق نمبر 15، جلد 16، مؤرخہ 18 اگست 1950)

(16) ''ذکر غالب''

از مالک رام صاحب، ایم۔اے۔ 232 صفحات، مکتبہ جامعہ، دہلی

پنجاب کے مالک رام صاحب غالبیات کے ماہروں میں ہیں اور غالب شناسی کے ایک ممتاز مالک۔ ذکر غالب ان کے قلم سے عرصہ ہوا نکل کر چھپ چکی تھی اور اب یہ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا ہے۔ پوری نظر ثانی اور معقول اضافہ کے بعد کتاب قابل قدر پہلے بھی تھی اور اب تو اور زیادہ جامع و متوازن ہو کر نکلی ہے۔ تین حصوں میں تقسیم ہے:

پہلا باب : سوانح حیات (ص: 9-114)

دوسرا باب : تصنیفات (ص: 110-156)

تیسرا باب : عادات واخلاق (ص: 157-230)

اور ان کے اندر غالب کی ذاتی زندگی و شخصی حالات کمالات فن، سیرت، کردار، تینوں پر اچھی خاصی اور مستند معلومات جمع ہوگئی ہیں۔

عنوانات ہر ہر باب میں کثرت سے ہیں، ضرورت تھی کہ ان سب کو فہرست مضامین میں درج کیا جاتا۔ اس نوعیت کی کتابوں میں فہرست کا اتنا غیر ضروری اختصار اور بے محل اجمال طبیعت کو بہت کھل جاتا ہے۔

کتاب غالبیات کے ہر شعبہ پر حاوی ہے البتہ جی یہ چاہتا تھا کہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب بھی اچھا خاصا اس میں موجود ہوتا۔ ایک کمی اور محسوس ہوئی، نواب یوسف علی خاں ناظم (والی رامپور) شاگرد غالب کے نام سے جو دیوان چھپا ہے اس میں غزلوں کا رنگ استاد کے رنگ سے اس غیر معمولی حد تک ملتا جلتا ہوا ہے کہ بعض بعض شعروں پر تو وجدان کو یقین بھی نہیں آتا کہ وہ بجز غالب کے کسی اور کے ہو سکتے ہیں۔ اس مسئلہ پر ذکر غالب کے صفحات میں روشنی ضروری تھی۔

کتاب ہر غالب دوست و غالب پسند پڑھے لکھے کے مطالعہ میں آنے کے قابل ہے۔ کتابت کی غلطیوں کی کثرت افسوسناک حد تک ہے۔ شروع میں غالب کی وہ تصویر درج ہے جو اب تک زیادہ شائع نہیں ہوئی ہے اور اس میں غالب زیادہ بوڑھے نہیں صرف ادھیڑ عمر کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا دیباچہ بھی ڈاکٹر عابد حسین کے قلم سے ہے۔

(صدق جدید نمبر 29، جلد 1، مورخہ 15 جون 1951)

(17) ''شرح دیوان غالب''

از نظم طباطبائی لکھنوی

368 صفحات، مجلد، قیمت ساڑھے تین روپیہ

انوار بک ڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ (ہند)،

مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، قریب ڈینسو ہال کراچی، پاکستان

دیوان غالب (اردو) کی شرحیں بڑی اور چھوٹی اب تک اللہ کو علم ہے کتنی نکل چکی ہیں، لیکن ان میں سے ایک قدیم ترین اور مشہور ترین شرح مولوی سید علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم (لکھنوی ثم حیدر آبادی) کی ہے، اس کا یہ نیا ایڈیشن (غالباً مدرسی ضرورت سے) اب نکلا ہے۔ نظم طباطبائی اپنے زمانہ میں ایک ممتاز ادیب اور نکتہ رس سخن سنج ہوئے ہیں۔ ''نقاد'' کا لفظ اس وقت تک ٹکسال سے باہر تھا۔ اس کا چلن تو اب ہوا ہے۔

نظم شاعر بھی اچھے خاصے تھے، شرح میں خوب خوب دادِ سخن سنجی دی ہے اور کہیں کہیں داد سخنوری بھی۔ فن عروض و قافیہ کے بھی ماہر تھے۔ کتاب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرح کی کشکول شعر و ادب سامنے ہے۔ کہیں ذوق غالب کے سہروں پر محاکمہ ہو رہا ہے۔ کہیں ناسخ و آتش کے معرکے کے بیان ہو رہے ہیں۔ کہیں فلاں قاعدۂ عروضی اور فلاں نکتہ، بلاغت کا افادہ ہو رہا ہے اور کہیں شارح صاحب خود استاد بنے ہوئے شاعر کے کلام پر اصلاح کرتے جا رہے ہیں۔

''اصلاح''؟ جی ہاں! اصلاح۔ اور ایسے منظر نادر بھی نہیں۔ صفحہ 194 پر شاعر کے مصرع:

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پر شارح کو جو جوش آیا ہے تو پہلے تو پورے دو صفحہ نثر عاری کے لکھ ڈالے اور اس کے بعد جو پیش مصرعہ لگانے شروع کیے تو ایک دو نہیں 180 مصرع اپنی طرف سے لگا کر دکھا دیے۔ دو ایک نمونہ کے طور پر سن لیجیے:

پردہ اٹھا کے ہم نے تمھیں دیکھ تو لیا\
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے\
قاضی کے گھر سے شیشۂ صہبا نکال لائے\
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

لے لیں بلائیں سبزۂ خط نگار کی
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
چوری سے بوسۂ خط رخسار لے لیا
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

قلم کا لفظ آتے ہی شارح کا ذہن شراب کی قلم، مہندی کی قلم، رخسار کی قلم وغیرہ ساری بوقلمونیوں کی طرف منتقل ہو گیا اور اس نے ہر ہر ضلع کو نظم کر ڈالا۔ قلم اس پر بھی نہ رکا تو لکھنؤ کے کسی مشاعرہ کے مصرعہ طرح ''اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں'' کو لے کر اس پر اپنے 21 مصرع نقل کر کے اپنے زور قلم کا تماشا دکھا دیا۔

غالب ایک تو دہلوی اور پھر دہلویوں میں مخصوص خودداری اور منفرد رنگ سخن کے مالک لیکن کہیں کہیں بہر حال بولی لکھنؤ والوں کی بھی بول گئے ہیں جیسے:

پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

ایسے موقعوں پر شارح نے تو جیسے پالا مار لیا۔ ''خسرو'' اور اس سے متصل ''شیریں''... یہ موقع تو اللہ دے اور بندہ لے کا تھا۔ لیکن شارح صرف اشارہ کر کے گزر جاتے ہیں۔

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے:

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

اس کی شرح شارح کے اصل الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''کسی کی مصیبت پر جوش محبت میں کہتے ہیں'' ہے ہے میں اس کے پاؤں پڑوں'' اور یہ بڑے محاورے کا لفظ ہے۔ اور التجا کے لیے ''تو پاؤں پڑنا'' مشہور بات ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب ''ہیہات'' کا لفظ ضلع کا بول گئے ہیں۔ مگر کیا کرتے، مصرعہ میں ایک رکن کم پڑتا تھا۔

لیکن کہیں کہیں حضرت شارح کی نظر بھی چوک ہی گئی ہے۔ مثلاً صفحہ 245 پر ایک مصرعہ ہے:

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی

یہ مصرعہ اس نوٹ سے خالی ہے کہ ''نسیم'' کے لیے ''ہوا'' خواہی کیا خوب!

غرض کتاب بحیثیت مجموعی غالب فہمی ہی کی کلید نہیں بلکہ کم و بیش اردو شعر و ادب کے معلم

کے کام کی ہے لیکن اب اسے کیا کیجیے کہ امتداد زمانہ کا قانون شعر کی طرح شرح شعر پر بھی عامل ہے۔اور جناب ''نظم'' کی ''نثر'' میں اب وہ تازگی باقی نہیں جس کی تلاش قدرتاً ہر پڑھنے والے کو ہوتی ہے بلکہ جابجا فرسودہ ہوگئی ہے۔

شروع میں فہرست مضامین کی قسم کی کسی چیز کا سرے سے نہ ہونا ناشر صاحب کی وضعداری کا چاہے ثبوت ہو لیکن مستعدی وحسن توجہ کا تو کوئی اچھا ثبوت نہیں۔

(صدق جدید نمبر 21، جلد 4، مؤرخہ 23 اپریل 1954)

(18) ''آب حیات کا تنقیدی مطالعہ''

از سید مسعود حسن صاحب رضوی، سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو، لکھنؤ یونیورسٹی

98 صفحات، مجلد مع گردپوش، قیمت ڈیڑھ روپیہ، کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ

آب حیات، محمد حسین آزاد کا شاہکار ادب اردو کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ موضوع اردو شاعری کی تاریخ اور اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا ادبی پایہ ہمیشہ سے مسلم رہا ہے۔ تاریخی پہلو اس کے برعکس شروع ہی سے زیر بحث چلا آرہا ہے۔ بشری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے کس بشر کی کتاب خالی ہوسکتی ہے اور پھر تاریخ تو موضوع ہی ایسا ہے کہ اس کے ہر ہر بیان سے متعلق متضاد نظریے اور دو نقطۂ نظر ناگزیر سے ہیں۔ آب حیات بھی مدت سے ناقدوں، مبصروں اور ادبی تاریخ نگاروں کی ہدف بنی ہوئی ہے فلاں دعویٰ بے بنیاد، فلاں بیان غلط، فلاں عبارت مبالغہ آمیز، فلاں بات خلاف تحقیق وقس علیٰ ہٰذا۔ اور یہ کہنے والے بھی سب ایسے ہی ویسے ہماوشما نہیں بابائے اردو عبدالحق اور صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے بالغ نظر ناقدین بھی اس جماعت میں شامل ہیں۔

تنقید تنقید کی حد تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا۔ غلو نے جلد ہی تنقید کو تنقیص میں بدل دیا اور ایک مصیبت یہ بھی آپڑی کہ آزاد شیعہ تھے اور ان کے نکتہ چیں اتفاق سے عموماً اہل سنت بہر حال ''ردعمل'' لازمی تھا۔ افراط اور تفریط کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ ادھر سے جواب و دفاع کی بھی پلٹنیں آراستہ ہوکر نکلنے لگیں اور مثالب کے جوڑ پر مناقب کے علم بلند ہونے لگے۔ پیش نظر رسالہ اسی نصرت وحمایت کی کوششوں کا ایک بلند و بلیغ نمونہ ہے۔

سید مسعود حسن صاحب رضوی کا نام ادب اردو کے طلبہ کے لیے غیر معروف یا نامانوس

نہیں۔اس دشت کے پرانے سیاح۔اس میدان کے نامی شہسوار ہیں۔بات عموماً مدلل کہنے کے عادی ہیں۔انداز بیان دل نشیں ہے اور جہاں تک رنگ انشا کا تعلق ہے خود بھی آزاد کی جانشینی کا حق کسی حد تک ادا کر رہے ہیں۔ان کی یہ تراوش قلم ''در مدح استاد'' کا ایک دلچسپ نقشہ ہے، چلے ہوئے اعتراضوں کو ایک ایک کر کے سمیٹا ہے اور پھر اپنی معلومات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا ہے۔موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے رسالہ قابل دید ہے۔

شکایت صرف ایک ہے، ممدوح کی حمایت میں جو چاہتے لکھتے، یہاں تک کہ یہ لکھ جانے میں بھی مضائقہ نہیں کہ:

> ''جس نے 'آب حیات' کی سی پُر از معلومات اور زندۂ جاوید کتاب دی اس کی ساری محنتوں پر بے دردانہ تنقید اور بے بنیاد الزامات سے پانی پھیر دینا احسان فراموشی کی انتہا ہے''۔

لیکن اس کے معا بعد کا فقرہ، نظر ثانی کے وقت مصنف خود غور فرمالیں کہ ان کی متانت تحریر سے کہاں تک میل کھاتا ہے۔

> ''آزاد کے بے درد معترضوں میں زیادہ تر جہل مرکب میں گرفتار ہیں مگر کچھ تعصب کے شکار اور کچھ حسد کے مریض بھی ہیں''۔

(صدق جدید نمبر 42، جلد 4، مؤرخہ 14 مئی 1954)

(19) ''گل رعنا''

از مرتبہ مالک رام صاحب
قیمت مجلد سات روپیہ پچاس پیسے
علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی

یہ کتاب غالب کا تقریباً اولین دیوان اردو اور فارسی ہے۔اس کا زمانہ انتخاب 1828 ہے اور اس میں اردو کی غزلیں 116 اور فارسی 27 کی تعداد میں درج ہیں اور اردو غزلیں زیادہ تر تخلص اسد کے ساتھ ہیں۔فارسی کلام کے شروع میں ایک فارسی قصیدہ بھی ہے۔کلام کے شروع والا دیباچہ اور خاتمہ بھی غالب ہی کے قلم سے فارسی میں ہے اور مقدمہ مرتب کے قلم سے پُر مغز ہے۔ اگرچہ محمد حسین آزاد پر گرفت کہیں زیادہ سخت ہوگئی ہے، حاشیے بھی محنت و دیدہ ریزی سے لکھے گئے

ہیں۔ غالبیات کے ذخیرہ میں کتاب کے آجانے سے ایک معقول وقیمتی اضافہ ہوگیا ہے۔

(صدق جدید نمبر 36، جلد 20، مورخہ 14 اگست 1970)

(20) ''شرح دیوان غالب''

از سید محمد احمد بیخود موہانی مرحوم

614 صفحات، تقطیع 26x20، مجلد، قیمت پندرہ روپیہ

دانش محل امین آباد، لکھنؤ

آج سے کوئی 35-30 سال پہلے لکھنؤ میں جناب بیخود موہانی (استاد فارسی، شیعہ کالج لکھنؤ) اردو کے ایک ممتاز نقاد وادیب ومحقق رہا کرتے تھے۔ ان کی شرح غالب کے تذکرے اہل ادب کی زبان سے سننے میں آتے رہتے تھے۔ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اب پہلی دفعہ مصنف کی وفات کے کوئی تیس سال بعد جاکر چھپی ہے اور شارح کی شہرت کے عین مطابق ہے، شروع میں دیباچہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو (لکھنؤ یونیورسٹی) کے قلم سے۔ دیباچہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بلیغ وپُر لطف ہے اور کچھ نہ کہنے پر بھی بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔

غالب کی شرحیں متعدد ایسی ہیں جو خود شرح طلب بن گئی ہیں، یہ ان میں نہیں، یہ بس شرح ہے جیسی کہ شرح ہونی چاہیے۔ یہ غالب کے حل مطالب کی ایک کلید ہے۔ طبا طبائی مرحوم سے اس کی نوک جھونک خصوصیت کے ساتھ قابل دید ہے۔ غالب کے شائقین اگر اس شرح کو اپنے مطالعہ میں رکھیں گے تو انشاء اللہ اپنے کو گھاٹے میں نہ پائیں گے۔

(صدق جدید نمبر 51، جلد 20، مورخہ 27 نومبر 1970)

(21) ''چند ہم عصر''

از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

217 صفحات، تقطیع 22x18، قیمت تین روپیہ

انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی (پاکستان)

اپنے معاصرین پر قلم اٹھانا جہاں اس لحاظ سے آسان بھی بہت ہے کہ جتنے مواقع ان سے واقفیت کے حاصل رہتے ہیں اتنے گزشتہ تاریخی شخصیتوں کے لیے کہاں ممکن ہیں۔ وہیں اس

اعتبار سے سخت دشوار بھی ہے کہ قلم ان پر لکھنے کے لیے آزاد نہیں ہوتا بلکہ کہیں دباؤ، کہیں مروت، کہیں خوف، کہیں لالچ، کہیں خوشامد، کہیں حسد، غرض کوئی نہ کوئی بیڑی قلم کے پیر میں پڑی ہی رہتی ہے۔ قابل داد ہے وہ صاحب قلم جو ان سب بیڑیوں کو توڑتا اپنی آنکھوں دیکھے ہوئے لوگوں کی سیدھے سادے لفظوں میں رنگ آمیزی کے بغیر (رنگ آمیزی کے بغیر''؛ ''رنگ'' کے بغیر نہیں) تصویر کھینچ لے جائے۔

بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق کچھ اس قسم کا مذاق فطرت ہی سے لے کر آئے ہیں۔ آدمی جذباتی نہیں، معقولی قسم کے ہیں اور پھر جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے لگی لپٹی کے بغیر بے دھڑک کہہ بھی ڈالتے ہیں۔ اپنی اس صلاحیت کا صحیح اندازہ کر کے انھوں نے اپنے 23 ہم عصروں کے چربے تیار کر دیے ہیں اور ان 23 میں کوئی قید چھوٹے بڑے کی نہیں ان میں نامور مشاہیر بھی ہیں جیسے سر سید، حالی، امیر مینائی و محمد علی اور گمنام بھی جیسے نور خاں اور نام دیو مالی اور بعض ایسے بھی جو نہ شہرت کے بام بلند پر ہیں نہ گمنامی کے قعر میں بلکہ دونوں کے ادھر میں جیسے ڈاکٹر شیخ اقبال میرن صاحب اور پروفیسر ریبٹ سک، اور تقسیم عنوانات اگر بجائے طبقاتی کے زمانی معیار سے کیجیے تو مجموعہ کے سب سے پہلے مضمون پر تاریخ 1900 درج نظر آئے گی اور سب سے آخری پر سنہ 1953 پڑا ہوا، گویا ایک ادیب کی 50 سال سے اوپر کی مشق قلم کا مرقع۔ مجموعہ کی ندرت کا یہ پہلو بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔

کتاب شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور سنجیدگی خشکی کے مرادف نہیں۔ اشخاص و رجال کی کرداری خصوصیات پر روشنی بھی اس سے خوب پڑتی ہے۔ مشاہیر و غیر مشاہیر دونوں کی زندگیوں کو مصنف نے خوب پرکھا، جانچا، تولا ہے۔ مضمون اپنی اپنی جگہ خود ہی قابل مطالعہ ہیں لیکن نمبر اول پر میرن صاحب سوز خوان پر ہے۔ یہ وہی میرن صاحب ہیں جن کا ذکر غالب کے خطوط میں بار بار آ رہا ہے۔ بابائے اردو قدیم صحبتیں دیکھے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی بزم جدید کی میز کے بھی مزے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے قلم میں قدرتاً دونوں رنگ کی دلچسپیوں کا منظر کھنچ آیا ہے۔ زبان کی خدمت میں ان کی عمر گزر چکی آج کس کی مجال ہے جو ان کی زبان پر حرف گیری کر سکے پھر بھی بھول چوک لازمۂ بشریت ہے۔ دو جگہ ذرا کھٹک پیدا ہوئی شبہات محض استفادتاً عرض خدمت ہیں۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حالات میں لکھتے ہیں: ''ان پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا اور ان کے آخر زمانہ کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بو آتی

ہے"۔(ص 109)

لفظ "بو" فارسی میں جو بھی وسیع مفہوم رکھتا ہو، اردو میں 'بو' اور 'بو آنا' تو صرف محل ذم پر آتا ہے۔ اور 'بدبو' کے معنیٰ میں چلا ہوا ہے۔

اسی طرح ص 183 پر غدر کے حالات میں ہے:

"سارے شہر میں بھاگڑ مچ گئی۔ سیکڑوں گولی کا نشانہ بنے، صدہا سولی پر چڑھادیے گئے"۔

'سولی' بے شک بعض اہل زبان 'پھانسی' کے معنی میں بھی لکھ گئے ہیں۔ تاہم مصنف کے قلم حقیقت رقم کے زیادہ شایان شان یہ فقرہ ہوتا "صدہا پھانسی پر لٹکادیے گئے"۔

کتاب چند ہی سال کے عرصہ میں چوتھی بار شائع ہوئی ہے اور اب کی پانچ مقالوں کے اضافہ کے ساتھ، حسرت موہانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ، کتاب کے حسن قبول کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی اور حسن قبول بلاوجہ نہیں۔

(صدق جدید نمبر 42، جلد 8، مؤرخہ 8 مارچ 1943)

(22) "غبارِ خاطر"

از مولانا ابوالکلام آزاد

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

"الہلال" مرحوم کی زبان اور تذکرہ کے اسلوب بیان کے دیکھنے کو آنکھیں ایک عرصۂ دراز سے ترس رہی تھیں اور اب بظاہر کوئی صورت اس تمنا کے پورے ہونے کی نہ تھی۔ مصنف ماشاءاللہ زندہ وسلامت لیکن اب دوسروں کی نذر ہو چکے تھے اور گویا اپنی زبان تک بھول چکے تھے۔ اکبر نے تو یہاں تک کہا تھا:

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں
زبان میری ہے بات ان کی

لیکن یہاں معاملہ ان حدود سے بھی گزر چکا تھا۔ یہاں بات تو "ان" کی تھی ہی زبان بھی اپنی نہیں رہی تھی انہی کی ہوگئی تھی۔ لیکن جو حکیم مطلق بہتے دریا کو پھیر لانے پر قادر ہے اس کی مشیت وحکمت کا تقاضا ہوا کہ مولانا ایک بار پھر قیدِ فرنگ میں مبتلا ہوں اور اب جب کہ باہر نکلیں تو

اپنی رفیق حیات بی بی زلیخا کی مفارقت دائمی کے غم میں مصرادب کے یوسف بن کرنکلیں۔ غبار خاطر مولانا کے ان بیس بائیس مفصل خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے احمد نگر قلعہ میں محبوس ہوکر اگست 1942 اور جون 1945 کے درمیان اپنے حبیب قدیم مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ علی گڑھ کے نام عالم خیال میں تحریر فرمائے ہیں۔ عالم خیال اس معنی میں کہ ان خطوط کو کبھی مکتوب الیہ کے نام روانہ کرنے کی نوبت نہ آئی۔ کتاب کو مجموعۂ خطوط کہنا بھی بالکل صحیح بیانی نہیں۔ خطوط یہ صرف ظاہر و قالب کے لحاظ سے ہیں ورنہ معنی وحقیقت کے اعتبار سے یہ یکسر ادبی اور علمی مقالات ہیں۔

ابوالکلام آزاد اردو کے ایک خاص اسلوب بیان کے موجد و مالک ہیں اور یہ مجموعہ ابوالکلامی انشاء کا بہترین نمونہ ہے۔ پاک ستھرا مذاق جسے ابتذال یا بازاریت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ ہموار و یک رنگ بلند سطح جس میں پستیوں کا گزر نہیں۔ شرافت ومتانت جو ادبی سفلہ پن کے نام سے بھی آشنا نہیں مولانا کے مقام ادب کے خصوصیات میں سے ہیں۔ اس چھوٹے سے مجموعہ میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ ساتھ ہی شوخی ورنگینی کسی ایک صفحہ میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ذکر یہاں صدر کانگریس کی سیاسیات یا صاحب ترجمان القرآن کے عقائد کا نہیں صرف ادیب، انشا پرداز و صاحب طرز ابوالکلام کے کمالات وکرامات کا ہے اور ان حدود کے اندر حق یہ ہے کہ ابوالکلام اپنی نظیر آپ ہیں:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شروع میں ایک خاصا مفصل مقدمہ مولانا کے سکریٹری محمد اجمل خاں کے نام سے ہے اور اگر اس کے سارے فقرے اور ساری عبارتیں ان کے قلم سے بھی مان لی جائیں تو پھر ایک نئے عقیدہ 'اتحاد' 'حلول' کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔

تاریخ فلسفہ عقیدہ، لطیف کلام ادب اعلیٰ سب کچھ ان صفحات کے اندر مل جائے گا لیکن یہ سب دماغ کی کاوشیں اور تراشیں ہوں گی، دل کے حصے کی جگہ بھی دماغ ہی نے لے لی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں محمد علی جوہرؒ اور ابوالکلام آزاد دونوں معاصر ایک دوسرے سے بالکل متضاد ایک ایک سرے پر نظر آتے ہیں۔ کتاب بھر میں لے دے کے ایک مکتوب ایسا ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے درد و گداز کا مرقع ہوسکتا ہے اور یہ مولانا نے اپنی رفیق حیات کی خدمات پر لکھا ہے لیکن یہاں بھی مولانا زیادہ سے زیادہ کترا کے نکل گئے ہیں صرف اس کے آخری صفحہ پر البتہ ذرا ملول و

غمگین نظر آتے ہیں۔

(صدق نمبر19، جلد12، مؤرخہ 3 جولائی 1946)

(23) ''خطوطِ غالب'' (جلد اول)

مرتبہ مولوی مہیش پرشاد صاحب

ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد

غالب کے خطوط میں جو سادگی، بے ساختگی و دلآویزی ہے محتاج بیان نہیں۔ مختلف مجموعے اوران کے متعدد ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں لیکن تقریباً سب کے سب غلط اور اہم حیثیتوں سے ناقص، شکر ہے کہ اب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے حسن اہتمام اور مولوی مہیش پرشاد صاحب استاد فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کی کاوش سے پہلی بار ایک مکمل و صحیح مجموعہ اردو مکتوبات غالب کا شائع ہونے میں آیا ہے۔ لفظ صحیح اضافی اعتبار سے کہا گیا ورنہ ایسی کون سی بشری کوشش ہے جس میں سہو و نسیان، خطا و غلطی کا گزر نہ ہو۔ اتنی سعی تصحیح اور ایک لمبے غلط نامہ کے باوجود کم از کم یہ غلطی تو ریویو نگار کی سرسری اور اچٹتی ہوئی نظر میں آئی ہی گئی۔ 193 پر مکتوب 183 کے شروع میں صراحت ہے دوشنبہ کے دن اور 15 فروری کی لیکن اس کے بعد ہی درج ہے کل دوشنبہ 16 فروری ہے۔ ظاہر ہے یہ سہ شنبہ ہونا چاہیے۔

خطوط تعداد میں 452 ہیں اور 19 مختلف اصحاب کے نام ہیں۔ فاضل مرتب نے نہ صرف تصحیح کا پورا اہتمام کیا ہے بلکہ ان پر اور بھی بہت کچھ محنت صرف کی ہے، نمبر ڈالا ہے، تاریخ ڈالی ہے و قس علیٰ ہٰذا۔ شروع میں ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس پر جو بھی کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (صدر شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی) کی محققانہ نظر ثانی نے پوری کردی ہے۔ 15-16 صفحہ کا مفصل مقدمہ ان کے قلم سے بھی ہے جو اخباروں کی رسمی زبانوں میں نہیں بلکہ واقعی اور صحیح معنوں میں بصیرت افروز ہے۔

خطوط غالب کے ادب و انشا سے متعلق کچھ کہنا تحصیل لاحاصل ہے۔ حیرت ہوئی کہ آج سے اسّی سال قبل اس بلا کی روانی، شستگی، برجستگی ظالم کے قلم میں کہاں سے آگئی تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر لسانی وادبی معلومات کے اعتبار سے بھی مجموعہ قابل مطالعہ ہے۔ اردو کے مبتدی منتہی ہر درجہ و مرتبہ کے طلبہ کے لیے۔ دوسری جلد کی اشاعت کا انتظار شائقین ادب

کو یقیناً رہے گا۔

(صدق نمبر13، جلد7، مؤرخہ 28 جولائی 1941)

(24) ''غالب''

از چودھری غلام رسول مہر
ناشر مبارک علی، لاہور

ادبی کتابوں پر طویل تبصرے 'صدق' کے موضوع سے خارج ہیں اور نہ اب اتنی فرصت ہے کہ ادبی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جا سکے لیکن بعض کتابوں میں کشش کچھ اس بلا کی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہے۔ غالب کے نام سے کون اردو خواں واقف نہیں؟ وہی اردو کا نامی گرامی شاعر اور مہر صاحب انقلاب کو بھی غیر معروف کون کہہ سکتا ہے؟ انقلاب سے ذہن جواہر لال اور ماسکو اسٹالین اور کمیونزم کی طرف منتقل نہ ہو۔ وہ انقلاب بھی نہیں جو کبھی مستقبل میں برپا ہوگا اور جس کے ابھی صرف دو شاعر پیدا ہوئے ہیں، بلکہ وہ انقلاب جو ہر چوبیس گھنٹے لاہور کی سرزمین پر آج بھی برپا ہوتا رہتا ہے۔

پورا مطالعہ تو کیا ہو سکتا ہے جگہ جگہ چھچلتی ہوئی نظر پڑی اور غلّہ کے چند دانوں سے پوری ڈھیری کا اندازہ ہو گیا۔ غالب پر اردو میں اب تک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو چکا ہے لیکن ضرورت پھر بھی باقی تھی اور وہ اس کتاب سے پوری ہوتی ہے۔ روزناموں کے ایڈیٹر کی زندگی مصروف ترین زندگی ہوتی ہے ان بیچاروں کو رات دن تار برقیوں کے ترجمے سے اور افتتاحیوں سے اتنی فرصت کہاں کہ ادبیات کا خیال بھی کر سکیں لیکن صحافتِ پنجاب کے مہر عالم تاب صاحب ''انقلاب'' کا کمال ہے کہ اپنی بیماری کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کے لکھ ڈالنے کا وقت نکال لیا اور پھر اس کی تیاری میں جن ہزارہا صفحات کی الٹ پلٹ کی ضرورت پڑی اس کا ذکر ہی نہیں۔ کتاب مغز کے لحاظ سے لیت ہوتی جب بھی ان حالات میں قابلِ قدر تھی لیکن وہ پست نہیں بلند ہے، ایسی بلند کہ اس کا مصنف اگر کسی یونیورسٹی کے سامنے اسے بطور ''مقالہ تحقیق'' پیش کر دیتا تو ڈگری تو کہیں گئی نہیں تھی۔

غالب کی سیرت، غالب کے حالات، غالب کی سوانح حیات ساری چیزیں مصنف نے کمال یہ کیا ہے کہ غالب ہی کی تحریروں سے، غالب ہی کے رقعات سے، تصانیف سے، اشعار

سے چن چن کر جمع کی ہیں، اس سلیقہ کے ساتھ کہ تالیف پر تصنیف کا گمان ہوتا ہے اور ان ریزہ چینیوں میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے، خود استاد غالب کی زبان کا تو پوچھنا ہی کیا، جہاں جو فقرہ ہے حسن بیان کی جھلک، لطف انشا کی کان، باقی مہر صاحب بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔ خوب خوب پیوند کاری کی ہے اور گلدستہ ایسا سجا کر رکھ دیا ہے کہ پتی پتی خوش رنگ بھی اور خوشبو سے دماغ کو معطر کر دینے والی بھی۔ ادبیات کا ذوق رکھنے والوں نے اگر قدر دانی کا ہاتھ نہ بڑھایا تو ناشر کا نقصان ہو یا نہ ہو محرومی خود ان کی یقینی ہے۔ ایک کسر یہ رہ گئی ہے کہ فہرست مضامین مجمل ہے خوب مفصل چاہیے تھی یا پھر آخر میں انڈکس موجود ہوتا۔ ایک جگہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بڑی محققانہ کتاب ہے لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا"۔

مہر صاحب کا یہ حسن ظن صرف اس توجیہ پر قابل عفو ہے کہ انھوں نے اس کے دوسرے مقالات غور و توجہ سے پڑھے نہیں ورنہ مضمون غالب ہی کی طرح اگر اس کے دوسرے مقالات کی بھی انھوں نے کرید کی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ "بڑی محققانہ" کا سرٹیفکیٹ ان کے قلم سے نکلتا۔

ادبی حیثیت سے قطع نظر تاریخی حیثیت سے بھی کتاب، کتاب خانوں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ ایک غالب کے ضمن میں اس دور کی اسلامی ہند کی کہنا چاہیے کہ معاشری، مجلسی اور سیاسی تاریخ خاصی جامعیت کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ ص 201 کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

اس زمانے میں غلّہ بہت گراں ہو گیا تھا، غالب اس گرانی کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

"غلّہ گراں ہے موت ارزاں ہے میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنا سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی"۔

"ذرا اپنے زمانے کی حالت کو سامنے رکھ کر اس گرانی کا اندازہ فرمائیے، غالب ان نرخوں کی بنا پر جو ہمارے نزدیک اعلیٰ درجہ کی ارزانی کے نرخ ہیں فرماتے ہیں کہ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد ایسا دور آنے والا ہے جس میں گرانی کے یہ نرخ انتہائی کشائش کے مقابلہ میں ارزاں

ہوں گے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کا مطالعہ محض لطف کی خاطر نہیں بلکہ نفع وحصول معلومات کی غرض سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ سالک صاحب نے رفاقت یہاں بھی نہ چھوڑی۔ ان کے قلم کا دیباچہ گو مختصر ہے لیکن دلچسپ، کتابت روشن، چھپائی صاف، کاغذ اچھا غرض باطن کے ساتھ ظاہر بھی خوش آیند۔

(صدق نمبر 2، جلد2، مؤرخہ 11 فروری 1937)

(25) "حیات جاوید"

ازمولانا الطاف حسین حالی

انجمن ترقی اردو نئی دہلی

سرسید احمد خاں کی مشہور ومعروف سوانح عمری، مولانا حالی کے قلم سے۔ فرطِ شہرت سے کسی جدید تعارف کی محتاج نہیں۔ خصوصیات بری بھلی جو کچھ بھی ہیں معلوم ومعروف ہیں۔ عرصہ سے ناپید تھی۔ انجمن نے نیا ایڈیشن اپنے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔ آخر میں اسماء واعلام کی فہرست بہت مفصل ہے۔

(ہفتہ وار صدق نمبر 7، جلد نمبر 6، مؤرخہ 17 جون 1940)

(26) "یادگار حالی"

ازصالحہ عابد حسین صاحبہ

241 صفحات، 44x88 مجلد مع گردپوش، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

اور

(27) "حیات سرسید"

ازنورالرحمٰن صاحب

164 صفحات، 22x18 مجلد، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

جدید انجمن ترقی اردو (ہند) نے آخر کچھ کتابیں چھاپنی شروع کردی ہیں۔ پرچھائیں کا

تعارف ان صفحوں میں پہلے کیا جا چکا ہے۔ آج یادگار حالی اور حیات سر سید پیش نظر ہیں۔

حالی دوسروں کی یادیں سناتے رہے۔ سعدی اور غالب اور سر سید کی سوانح عمریاں چھاپتے رہے۔ خود ان غریب کی یاد اب تک کہنا چاہیے کہ کسی کو آئی ہی نہیں۔ اور گو 1937 میں ان کی پیدائش کی صد سالہ جوبلی خوب دھوم دھام سے منائی گئی پھر بھی ان کی سیرت کا مسئلہ بدستور تشنہ ہی رہا، اور اس لیے ان کی وفات سے 35 سال بعد 1950 میں یہ یادگار بہت غنیمت بلکہ اس سے بھی کچھ زائد نظر آ رہی ہے۔ اس کی تالیف کا شرف انھی کی ایک عزیزہ (غالباً نواسی) بیگم صالحہ عابد حسین کے حصہ میں آیا ہے اور اس لیے اس میں حالی مرحوم کی خانگی نجی گھریلو زندگی کے بعض پہلوؤں کی تفصیل قدرتاً ذرا زیادہ ہے۔

شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے چند سطریں پیش لفظ کے عنوان سے ہیں اور کوئی پانچ صفحہ ''عطیہ مولانا ابوالکلام آزاد'' کے عنوان سے۔ ان کی ادبیت اور حسن انشاء کا کیا کہنا، کتاب بھر میں اور کچھ نہ ہوتا صرف یہی ہوتا تو بھی بہت کچھ تھا۔

کتاب مؤلفہ کی تمہید کے علاوہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔ نشو و نما، آب و رنگ، برگ و بار۔ لیکن یہ عنوانات بجائے اس شاعرانہ رنگ ڈھنگ کے اگر سیدھی سلیس زبان میں ہوتے تو پڑھنے والوں کو یہ سمجھنے میں زیادہ آسانی رہتی کہ ہر باب کے ماتحت کیا کیا ہے۔ عنوان ایسا ہونا چاہیے جو ہر باب کے لیے کلید کا کام بلا تکلف دے سکے۔ عمومی حیثیت سے بس یہ سمجھ لیا جائے کہ باب اول میں سادہ واقعات زندگی پیدائش سے وفات تک ہیں۔ دوسرے باب میں مختلف قومی، ملی جماعتوں کا ذکر اور تیسرے باب میں شاعری پر مفصل تبصرہ۔

مؤلفہ مخلص پُر جوش عقیدت مند ہیں لیکن تصنیف و تالیف میں زیادہ پختہ کار نہیں۔ کتاب متعدد سوالات کے جوابات میں قدرتاً تشنہ رہ گئی ہے۔ حالی کے شاگردوں کی فہرست ان کی کتابوں کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل زندگی میں اور بعد وفات بھی حالی کی زبان پر اعتراضات اور ان کے جوابات مسدس اور نیچرل شاعری کی شدید مخالفت کے اسباب۔ معمولات تصنیف و تالیف اور طریق شعر گوئی، اس قسم کے متعدد عنوانات کا خلا طبیعت کو بری طرح محسوس ہوتا ہے۔ مؤلفہ شاید خود بھی ''ترقی پسند'' شاعری کی ہمدرد ہیں اور اس لیے حالی کو گھسیٹ کر اس میدان میں لائی ہیں۔ حالانکہ ''ترقی پسندی'' جس اصطلاحی معنی میں آج چلی ہوئی ہے، حالی غریب تو اس کا نام سن کر ہی شاید کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتے۔ مؤلفہ جس معنی میں حالی کے کلام کو ''غیر

فرقہ وارانہ'' ثابت کرنا چاہتی ہیں حالی اسے ہرگز اپنے حق میں داد نہ سمجھتے اور نہ اپنی شاعری کے اسلامی یا ملی ہونے سے وہ ذرہ بھر بھی شرماتے۔ مؤلفہ کی زبان اچھی خاصی سلیس اردو ہے لیکن کہیں کہیں انگریزیت اسی طرح غالب آگئی ہے مثلاً یہ فقرہ'' ذاتی پروپیگنڈے کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا'' (ص:8) صاف انگریزی وضع وترکیب کا ہے۔ ایک خاص صاحب جن کا شمار نہ اردو کے ادیبوں میں ہے نہ نقادوں میں، ان کی رائے کو بار بار سنداً پیش کرنا بھی مؤلفہ کے حسن ذوق کی کچھ اچھی شہادت نہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی اب بھی بہت غنیمت ہے۔ نظرثانی اور تھوڑی سی مزید توجہ کے بعد اسے طبع ثانی میں بہت بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ دوسری کتاب سرسید پر ہے، اس کے لکھنے والے اپنے زمانہ کے ایک ممتاز'' علیگ'' اور'' جامعی'' ہیں۔ خیالات عموماً سلجھے ہوئے رکھتے ہیں اور زبان بھی خاصی سلیس لکھ لینے پر قادر ہیں، لیکن اس خاص کتاب کی تحریر کے وقت معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ کچھ دودلے سے ہو رہے تھے۔ اپنا ضمیر اور رجحان طبیعت کسی طرف لیے جاتا تھا اور وقت کی مصلحتیں کسی طرف۔ یہ فکری حیص بیص اور ذہنی انتشار جگہ جگہ غیرمخفی ہے۔ اسی کے اثر سے کتاب میں کوئی خاص بات نہ پیدا ہو سکی اور کتاب گویا حیات جاوید کی تلخیص ہو کر رہ گئی۔ باقی نئی نسل کے لوگ جن کی دسترس سے حیات جاوید باہر ہے، ان کے لیے یہ کتاب بری بھی نہیں۔ سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے تعارف ان ڈیڑھ سو صفحات میں اچھا خاصا ہو جائے گا اور یہ بجائے خود کافی ہے۔

دو تین موٹی باتوں کی طرف اشارہ بہرحال ضروری ہے۔ جن کا شمول طبع ثانی میں ہو جانا چاہیے:

(1) سرسید کے مشہور و معروف صاحب زادے جسٹس محمود کو کوئی'' دماغی مرض'' (ص:83) ہرگز لاحق نہ تھا جس نے آخر زمانہ میں سرسید کی زندگی کو بے لطف بنا دیا تھا۔ 1900 میں حیات جاوید کی اشاعت کے وقت یہ اخفاء جتنا بھی'' مصلحت آمیز'' ہو آج 50 میں اس بڑی ہی افسوس ناک عادت مخموری یا بدمستی کا نام کھل کر لینا ہرگز'' راستی فتنہ انگیز'' کے دائرہ میں نہیں آتا۔

(2) مرض الموت کے حالات ذرا تفصیل سے لکھنے تھے۔ بعض بڑے مؤثر حالات بھی مل سکتے ہیں۔

(3) خاص خاص تصانیف پر تبصرہ ذرا مفصل اور جاندار لفظوں میں ہونا تھا۔ اصل کتابوں

کے مطالعہ کے بعد نہ کہ ان سے محض بالواسطہ واقفیت حاصل کر کے۔

(4) ہمیشہ ان کی یہ رائے رہی کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے (ص:128)۔ یہ رائے جس مطلق صورت میں یہاں درج کردی گئی ہے یہ سرسید کے مسلک کی صحیح ترجمان نہیں۔

دونوں کتابیں چھپائی، کتابت، کاغذ، جلد کے اعتبار سے خوشنما ہیں لیکن غلطیاں افسوس ہے کہ دونوں میں کثرت سے رہ گئی ہیں۔

(صدق جدید نمبر 21، جلد1، مؤرخہ 8 دسمبر 1950)

(28)''تلامذۂ غالب''

از مالک رام صاحب، ایم. اے.

324 صفحات، مجلد، قیمت ساڑھے سات روپیہ

مرکز تصنیف وتالیف، نکودر، پنجاب (ہند)، آزاد کتاب گھر، اردو بازار، دہلی

مالک رام صاحب غالب وغالبیات پر سند (اتھارٹی) کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُن کے قلم کا تازہ ترین افادہ تلامذۂ غالب ہے۔

موضوع نہ کسی شرح کا محتاج نہ تشریح کا، نام سے بالکل ظاہر ہے۔ کتاب غالب سے نسبت شاگردی رکھنے والے 146 شاعروں کے نام اور حالات کی جامع ہے۔ یہ خاصی فہرست بھی چاہے مکمل ہو! (اور مصنف نے دیباچہ میں کچھ ایسا لکھ بھی دیا ہے) تاہم کہیں اور تو اتنی بڑی فہرست بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کلام کے نمونے بھی ساتھ ساتھ درج ہیں، کہیں کم، کہیں زیادہ، اور رنگ کلام پر تبصرہ اس پر مستزاد۔ وہ بھی اکثر جچا تلا، ماہرانہ۔ یہ تو رہا متن، اب اس پر اضافہ حاشیہ کی 29 شخصیتوں کا اور کیجیے۔ غالب یا غالب والوں سے کوئی نہ کوئی رشتہ اور رابطہ رکھنے والیاں، ان کی رنگارنگی کا اندازہ کرنے کے لیے یہ چند نام سن لیجیے:

حضرت شاہ غوث پانی پتی، سر شانتی سروپ بھٹناگر، ذکی مرادآبادی، مائل دہلوی، مفتی آزردہ، مرزا قتیل، داغ، رسا رامپوری، خواجہ غلام غوث بے خبر۔

شاگردوں میں نام ایسوں کے بھی نظر آتے ہیں جو آگے چل کر خود بھی استاد بلکہ بعض تو

استادوں کے استاد کہلائے، مثلاً شیفتہ، حالی، رشکی، مجروح، انور، سالک، سخن، اسماعیل میرٹھی، قدر بلگرامی، عزیز صفی پوری، اور ضمناً ایک انکشاف یہ بھی ہو رہا ہے کہ شاگرد سب مسلمان ہی نہ تھے خاصی تعداد میں ہندو بھی تھے۔ مثلاً شیو نرائن آرام، ہر گوپال تفتہ، جواہر سنگھ جوہر، بال مکند بے صبر، کوئی پندرہ نام توصراحت کے ساتھ آگئے ہیں۔ کلام کا انتخاب جو کتاب بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ عموماً وبیش تر خوب ہے اور مصنف کے ذوق سلیم کا آئینہ دار۔ اور پھر کلام پر جو تبصرہ کرتے گئے ہیں لطیف و سبک و دلکش و بلیغ، وہ تو وقت کے بہت سے پیشہ ور نقادوں کے لیے پورے سرمۂ چشم بصیرت کا دے سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ تنقید کا نام لے کر ایک اکھاڑا مجادلہ ومناقشہ کا قائم کر دیا اور بھاری بھرکم اصطلاحیں باہر سے لا لا کر مضمون کو ایسا ثقیل در ثقیل کرتے چلے گئے کہ آخر میں وہ ایک گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

اور پڑھنے والا سر پیٹ کر رہ گیا، کہ اپنے پلّے تو کچھ بھی نہ پڑا، بجز چند فنی اصطلاحوں کے۔

تصویروں کا اہتمام خصوصی بھی قابل ذکر ہے۔

سنہ وتاریخ کا التزام بھی قابل داد ہے۔ خصوصاً یہ کدوکاوش کہ حتی الامکان سنہ عیسوی اور سنہ ہجری دوش بدوش چلیں۔ اور لیجیے اس جرأت مندی کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے کہ ''ہنگامہ 1857'' کتاب بھر میں ''ہنگامہ 1857'' ہی ہے ''پہلی جنگ آزادی'' نہیں۔ اور عہد انگریزی کے خان بہادر اور رئیس رجواڑے سب عزت وشرافت ہی کے جامے میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ''ٹوڈی'' اور ''ٹوڈی بچے'' اور غداران وطن کے پتھراؤ سے ان کے حلیے بگاڑ دیے گئے ہوں۔ مذہبی عقیدے بھی قسم قسم کے، قدرتاً معرض بیان میں آئے، مصنف کے رکھ رکھاؤ نے تعصب تو خیر دور کی چیز ہے، اتنا بھی نہیں پتہ چلنے دیا ہے کہ خود ان کا گوشۂ چشم مسجد ومندر میں سے کس جانب ہے۔

سکتر کا لفظ انگریزی کے سکریٹری کی جگہ ہمارے قدیم ادب میں اچھا خاصا چل پڑا تھا، مگر پھر جو زبان پر ''صاحبیت'' نے دھاوا بولا تو ''سکریٹری'' کیا معنی ''سکریٹری شپ'' اور ''سکریٹریٹ'' سبھی اردو میں دھنس پڑے۔ مالک رام کا مالک بھلا کرے کہ انھوں نے ''سکتری'' کو پھر اس کی چھینی ہوئی جگہ پر بحال کر دیا (ص:22 مکرر)۔ تین سوا تین سو صفحہ کی اردو کتاب میں کُل دو لفظوں کا استعمال ذرا غریب و نامانوس سا معلوم ہوا۔

(1) صفحہ 9 اور صفحہ 215 وسط میں ''ترجمہ'' تذکرہ یا سوانح عمری کے معنی میں۔

(۲) صفحہ 218 (اخیر) ثمرہ یا حاصل کے بجائے نتیجہ اس فقرہ میں: ''اس نکاح کا نتیجہ دو صاحبزادے تھے''۔

بحیثیت مجموعی کتاب ادبی، شعری، سوانحی اعتبار سے اگر قابل دید ہے تو سلاست بیان اور شرافت وسلاست ذوق کے معیار سے قابل تقلید۔

(صدق جدید نمبر 49، جلد 9، مؤرخہ 6 نومبر 1959)

(29) ''ابوالکلام آزاد''

224 صفحات مع متعدد تصاویر

پبلی کیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن (وزارت اطلاعات)، نئی دہلی۔

کتاب پر مصنف یا مرتب کا نام درج نہیں۔ سرکار ہند کی وزارت اطلاعات کے شعبۂ اردو کی تیار کی ہوئی ہے جس کے سرکردہ جگن ناتھ آزاد صاحب ہیں۔ [آزاد پر کتاب ایک دوسرے آزاد ہی کے قلم سے]

کتاب کا کوئی مرتب ''کتاب'' نہیں۔ صرف متفرق مضامین، مختلف قلموں سے لکھے ہوئے اور متعدد دماغوں سے نکلے ہوئے، کا مجموعہ ہے۔ زیادہ تر نثر میں اور کچھ منظوم۔ عقیدت کے ہاتھوں نے یہ رنگ برنگ پھولوں کو جوڑ کر ایک خوشنما و دیدہ زیب گلدستہ تیار کر دیا ہے۔ ایک آدھ مضمون انگریزی سے ترجمہ ہو کر بھی آیا ہے۔ قدرتاً یہ کتاب سیرت یا سوانح عمری کا کام نہیں دے سکتی پھر بھی مرحوم کی زندگی کی جھلکیاں اچھی خاصی ان اوراق میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

مضامین سب کے سب معتقدوں اور مداحوں کے قلم ہی سے ہیں اور بعض شاید ایسے بھی ہیں جو مولانا کی وفات کے معاً بعد تحریر ہوئے ہیں اور اس لیے قدرتاً ان میں جذبات و تاثرات کی شدت بھی موجود ہے اور واقعات کی تحقیق و استناد کی طرف پورا التفات قائم نہیں رہ سکا ہے۔ مثلاً مہر صاحب کے قلم سے مولانا کی سیر چشمی اور خودداری کی مثال جو حکایت ایک رئیس کا عطیہ واپس کر دینے کی۔ صفحہ 155 تا صفحہ 157 بڑی تفصیل سے درج ہے۔ وہ مزید ثبوت کی محتاج تھی۔ 1912 میں جب یہ ذکر الہلال میں پہلی بار آیا تو اس وقت اس پر بڑی قیل و قال ہو چکی ہے۔ الندوہ کی ایڈیٹری کی حیثیت بھی تمام تر افسانوی ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شخص کی طرح مولانا کا بھی

ایک دور آخر نوعمری اور نو مشقی کا بھی رہا ہے اور عمر و مشق کے اس دور میں الندوہ کی مضمون نگاری ہی بڑے امتیاز و افتخار کی چیز تھی۔

بعض مضامین بڑے بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں۔ مثلاً ملیح آبادی صاحب کے قلم سے مولانا کا فقر و فاقہ پر، واقعی اب تک لوگ مولانا کی سیرت کے اس روشن و تابناک پہلو سے بے خبر تھے۔ حافظ علی بہادر خاں صاحب کا مضمون بھی۔ مولانا کی جیل کی زندگی پر بھی اپنی تصریحات سے اور اس سے بھی بڑھ کر بین السطور سے روشنی ڈالنے والا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، خان بہادر ظفر حسین خاں، محمد اجمل خاں صاحب کے مضامین اور حمیدہ سلطان صاحبہ کا مضمون بیگم آزاد پر، یہ سب پڑھنے کے قابل ہیں۔ حصہ نظم میں یحییٰ اعظمی صاحب کا مرثیہ شاعرانہ اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ظفر حسین خاں صاحب نے نفسیاتی دقت نظر سے کام لے کر مولانا کی سیرت کا جوہری خلاصہ ان لفظوں میں پیش کر دیا ہے کہ:

> ''غور کیجیے تو ان کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی ان کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا۔ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازے سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے جنھوں نے جمہور کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو لیڈروں کی صف اول میں کھڑا کر دیا۔ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت ان کی انشا پردازی کی رہین منت ہے اور یہی کہنا چاہیے ان کا اصلی جوہر ہے''۔ (صفحہ 19)

بالکل آخری صفحہ پر جو سادہ اور سنہ وار فہرست واقعات زندگی کی درج ہے وہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔ 1905 میں ازہر (قاہرہ) تعلیم کے لیے جانے اور 1907 میں وہاں سے واپس آنے کی مدیں تو بہر حال قابل اخراج ہیں۔ ہندوستان سے اس وقت باہر جانا ہی معرض گفتگو میں ہے۔ اسی طرح ابتدائی زمانے میں الندوہ میں مضمون نگاری اور اس زمانے کے بعد سہ روزہ وکیل (امرتسر) کی ایڈیٹری درج ہونے سے رہ گئی ہے۔ تبصرہ نگار بہر حال مسلمان ہے اور اسے دیکھ کر قدرتاً تاسف ہوا کہ کسی ایک مضمون نگار نے بھی مولانا کی دینی زندگی کا نقشہ، تفصیلات کیا معنی اجمالاً بھی پیش نہ کیا۔

کتاب بہ حیثیت مجموعی ایک بہت بڑے حلقے کو اپیل کرنے والی ہے اور یقین ہے کہ اس

حلقے میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(صدق جدید نمبر 51، جلد 9، مؤرخہ 16 نومبر 1959ء)

(30) ''مسدس حالی صدی ایڈیشن''

حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی۔

مولانا حالی صد سالہ یادگار کے غلغلہ سے ملک کی فضا ابھی گونج رہی ہے۔اس سلسلے میں حالی کے مشہور و مقبول مسدس کا بھی یہ خاص ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت سب نفیس وخوشنما، تقطیع مختصر، مجلد، سب سے پہلے مرتب ڈاکٹر عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی کا دیباچہ اس کے بعد سرسید کے خط کا عکس، اقبال کے قطعہ کا عکس، پھر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی وغیرہم متعدد مشاہیر ادب کے قلم سے مقدمات وتقریظات۔اور زربفت میں گاڑھے کا پیوند ایک تقریظ مدیر صدق کے قلم سے بھی ہے۔ پھر حالی کی تصویر، ایک عکس تحریر۔ نئے اور پرانے دونوں دیباچے اصل مسدس، ضمیمہ وغیرہ آخر میں مشکل اور نامانوس الفاظ کی فہرست اور بڑے سائز پر ایک نقشہ دنیائے اسلام کا۔

مسدس اپنی فرط شہرت سے نہ کسی تعریف کا محتاج ہے نہ تعارف کا۔ یہ ایڈیشن خاص تیاریوں کے بعد شائع ہوا ہے۔اس میں صحت اور حسن طباعت دونوں کا امکانی لحاظ رکھا گیا ہے۔ ظاہری ومعنوی دونوں حیثیتوں سے یہ ایڈیشن قابلِ قدر ہے۔ قیمت جو کچھ بھی ہو مناسب ہی ہوگی۔

(صدق نمبر 21 جلد نمبر 1 مورخہ یکم دسمبر 1935)

(31) ''رنگ محل از ساغر نظامی''

ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد۔

حسب تشریح سرورق یہ ساغر نظامی ادارہ اشاعت اردو حیدرآبادی رومانی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ساغر صاحب کا ایک خاص رنگ ہے اور وہ رنگ خوب جانا ہوا پہچانا ہوا ہے۔نازک اتنا کہ مفصل تحلیل اور مبسوط تنقید کا بار شاید اٹھا نہ سکے۔

ساغر کو غالباً اپنے تغزل کی قدر نہیں لیکن جو شاعر اس قسم کے شعر کہہ سکتا ہے۔

پھر میری عرضِ شوق میں پیدا ہیں جرأتیں — جھک کر یہ کیا کہا نگہ شرمسار نے
تم جو چھیڑو مسکرا کر ساز ہے — ورنہ ساز اک تار ہے آواز ہے
ٹوٹ کر ساغر بنا کرتا ہے دل — ساز کا حاصل شکستِ ساز ہے
ترے نام پر تو جوانی لٹا دی — جوانی نہیں زندگانی لٹا دی
دل سے بھی غم عشق کا چرچا نہیں کرتے — ہم ان کو خیالوں میں بھی رسوا نہیں کرتے
ہم ان سے ستم کا بھی تقاضا نہیں کرتے — احساس کرم حسن میں پیدا نہیں کرتے
جو زعم حسن میں رخ سے نقاب اٹھا دیا — ہم نے بھی شوق دید میں دل کو نظر بنا دیا

شاعر اگر اپنی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتا تو اس سے بڑھ کر خود نا شناس اور کون ہوگا؟ اور ترقی پسند تو شاید انھوں نے بننا چاہا بھی مگر نہ بن سکے۔ دیباچہ خیر ساغر کہتے جیسا بھی ہوں پڑھتے یقیناً بہت خوب ہیں ان کی آواز ان کے انداز ان کے تیور ان کا ترنم بجائے خود ایک دلکش غزل ہیں اور وفورتاثر میں کسی کا خیال لفظ اور معنی کی طرف جانے ہی کب پاتا ہے؟ کاش ان میں یہ قدرت ہوتی کہ اپنے کلام کو چھپوانے کے بجائے ہمیشہ زبان سے سناتے ہی رہتے۔

(صدق نمبر 29 جلد 9 22 / نومبر 1943)

(32) ''کیفیہ''

از پنڈت برج موہن ناتھ کیفی
انجمن ترقی اردو دہلی

کیفی صاحب دہلوی اردو کے کہنہ مشق لکھنے والے اور استادانہ معلومات رکھنے والے اہل قلم ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی ایک عمر کی ادبی، انشائی اور نحوی تحقیق کا گویا نچوڑ ہے اور کتاب کی حیثیت ایک لسانی کشکول کی سی ہے جس میں صرف، نحو، عروض، قافیہ، معانی، بیان، املا اور تاریخ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل کا بیان آ گیا ہے۔

کتاب متفرق معلومات کے لحاظ سے اچھی ہے اور تاریخ اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل کا بیان آ گیا ہے۔ اردو کے ہر طالب علم کے مطالعہ میں آنے بلکہ رہنے کے قابل اور طلبہ سے مراد محض مبتدی ہی نہیں منشی فاضلوں کو بھی ان صفحات میں بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی اور مطالعہ کا وقت ضائع نہ جائے گا۔ البتہ یہ بھی ظاہر ہے کہ پنڈت صاحب کے بنائے ہوئے اور

بتائے ہوئے قاعدے، ضابطے، ہر جگہ صحیح اور کافی نہیں ان کی تنقیدی اور ترمیمیں بجائے خود محتاج تنقید ہیں اور علم وادب کی دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔

نقائص کلام واغلاط کی مثالیں دینے میں کیفی صاحب مختلف ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم کے نام لیتے گئے ہیں۔ یہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ خصوصاً بعض جگہ نکتہ چینی حرف گیری کے اور اصلاح زبان پکڑنے کے مرادف ہوگئی ہے۔ اصلاح وتصحیح کا کام بغیر کسی تصریح کے بھی ہوسکتا تھا۔ مصنف کی بے پناہ تنقید کی زد میں نذیر احمد، حالی اور مولانا ابوالکلام سے لے کر نگار لکھنؤ اور زمیندار لاہور تک سب ہی اچھے برے زندہ اور مرحوم بڑے اور چھوٹے آجاتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جلال لکھنوی پر عنایت کچھ زیادہ ہے۔ عجب نہیں جو عالم برزخ سے اس وقت صدا آرہی ہو:
قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے۔

پختہ کار و پختہ قلم فاضل مصنف معاف فرمائیں کہ ''شتر گربہ'' جس سے انھوں نے بچایا اور ڈرایا ہے خود ان کی تحریر بھی اس کا شکار ہونے سے نہ بچ سکی کہیں تو عربیت کی وہ جزالت وغرابت کہ دہلی کے کشمیری پنڈت پر دیوبند یا فرنگی محل کے مولوی مولانا کا گمان اور کہیں جو ہندی نوازی کی لہر آئی تو اولڈ بوائے کی جگہ زبان ''پاٹھک'' پر کھلنے لگی۔ کیفی صاحب کے استاد فن ہونے میں کلام نہیں لیکن ضروری نہیں کہ جو ادیب گر ہو وہ ادیب بھی ہو۔ کتاب ان کی مفید کار آمد معلومات افزا، بہر صورت ہے۔

(صدق نمبر 3 جلد 10 مورخہ 16 مئی 1944)

(33) ''لاجونتی''

از سر شانتی سروپ بھٹناگر
25۔ تغلق روڈ، نئی دہلی۔

سر شانتی سروپ بھٹناگر ہندوستان کے ایک نامور سائنٹسٹ اور ماہر کیمیات کی صفِ اول میں ہیں۔ خیال بھی نہیں ہوسکتا کہ انھیں شاعری اور پھر اردو شاعری سے کوئی مناسبت ہوگی چہ جائیکہ وہ خود شعر کہتے ہوں۔ پیش نظر کتاب اس خیال کی عملی تردید میں ان کے کلام کا اردو مجموعہ ہے۔ ایک مختصر دیوان بلکہ کلیات۔

سر شانتی قوم کے کائستھ ہیں اور کائستھوں کا تعلق اردو بلکہ فارسی کے ساتھ کوئی نیا نہیں قدیم

اور گہرا ہے اور پھر سرشانتی تو اس کے علاوہ غالب کے مشہور و محبوب شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے ہیں۔ یہ دونوں خصوصیات سامنے رکھ لیجیے حیرت ہلکی ہو جائے گی مگر جائے گی ہرگز نہیں۔

کیمیا گر کی شاعری ہے ہر حال میں ایک اعجوبہ چیز! مجموعہ کے شروع میں متعدد اہلِ قلم کے قلم سے دیباچے، مقدمے، تقریظیں ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سرتج بہادر سپرو، خواجہ محمد شفیع دہلوی، خواجہ حسن نظامی وغیرہ۔ بعض۔ یقیناً بہت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ۔ بعض سرے سے غیر ضروری۔

نفس کلام نرم گرم دونوں قسم کا ہے، گرم زیادہ نرم کم۔ بیشتر حصہ پڑھنے، داد دینے کے قابل، کچھ حصہ خاموشی سے گزر جانے کے قابل اور ایسا کوئی نہیں جو رد کیے جانے یا ورق الٹ دینے کے قابل ہو۔ تشبیب کے حصے میں کلام کا رنگ قدرتاً عاشقانہ ہے لیکن فاسقانہ کہیں بھی نہیں۔ شاعر ہر حال میں شریف سنجیدہ خوددار ہے، رند، اوباش، کمینہ کسی ایک جگہ بھی نہیں۔ تبصرہ کا عنوان اگر کلام کے اعتبار سے ''کیمیا گر کی شاعری'' تھا تو صاحب کلام کے اعتبار سے ایک ''شریف شاعر'' ہونا چاہیے تھا۔

مجموعہ ایک طرح کا کشکول ہے۔ تغزل کا حصہ تو کچھ یوں ہی سا ہے۔ مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں واقعاتی لیکن نہ ایسی کہ خشکی حد تک پہنچ جائیں بلکہ طرز ادا کے لحاظ سے سب کے سب جذباتی، شاعر پورا عاشقِ صادق ہے لیکن عشق کی بازاری بیسوا کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی محترم رفیق حیات کے ساتھ جو دوسرے عالم میں پہنچ چکی ہیں۔ ساری کتاب شروع سے آخر تک اسی داستان دردسوز فراق سے رنگین ہے۔ شاعر ہندو ہے کلام ہندی اور ہندوانہ تلمیحات سے لبریز ہے لیکن نشو ونما یقیناً نیم اسلامی ماحول میں ہوئی اس لیے مسلم تخیلات کی کارفرمائی بھی کثرت سے نظر آرہی ہے۔ لاجونتی انھیں داغِ مفارقت دے جانے والی خاتون کا نام ہے ان کے مرثیہ میں نوحہ گر شاعر کہتا ہے:

ہیں چندر گپت کے کنبہ کی دختر نیک اختر　　صدا بلند ہوئی آئیں لیڈی بھٹناگر

یہ حکم تھا کوئی تکلیف نہ ہو ذرہ بھر　　بصد ادب تھے فرشتے کھڑے کچھ ادھر کچھ اُدھر

کیمیا گر فرنگی علوم وفنون میں ڈوب کر بھی فرنگ زدہ نہیں اسے اپنی مشرقی شرافت وعصمت عزیز ہے۔ وہ خاتون ہند کو فرنگی تیتریوں سے بالکل مختلف دیکھنا چاہتا ہے۔ صفحہ 40-45۔ اور وہ زن فرنگی کے فریب محبت سے بھی خوب آگاہ ہے۔ صفحہ 161-165۔ خیر یہ تو پھر ایک معاشری جزئیہ

ہے۔ بڑی اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ نامور سائنٹسٹ (مشہور فلسفی اقبال کی طرح) نہ ملحد ہے نہ مشکک، نہ دہری نہ لاادری بلکہ ٹھیٹھ خدا پرست۔ کاش ہمارے ہاں کے نوجوان فلسفہ کا صرف نام سن لینے اور سائنس کی صرف شد بد جان لینے والے اس مثال سے فائدہ اٹھائیں! ایک نظم خدا کے عنوان سے صفحہ 17-23 اور دوسری کیمیا و فلسفہ صفحہ 24-25 کے عنوان سے دونوں پڑھنے کے قابل ہیں۔

متعدد نظمیں سیاسی رنگ کی بھی ہیں اور ان میں ایک آدھ تو بالکل اقبال کے ابتدائی نقش قدم پر۔ مثلاً جشنِ فتح صفحہ 166-167 جس کی ترکیبیں تک اقبال کے "نیا شوالہ" سے ماخوذ ہیں اور انہی میں ایک آدھ ایسی بھی آگئی ہے جو سرشانتی کے عام مرنجاں مرنج و صلح جو مسلک کے منافی ہے مثلاً مریض ہر دل عزیز صفحہ 153-160۔ یہ نظم اس صورت سے اگر دینی ہی تھی تو کم از کم اس پر تاریخ نظم درج کر دینا تھی۔ 1946 کی دنیا 1920 کی دنیا سے کتنی مختلف ہو چکی ہے۔ بھائی شوکت کا ذکر اس میں جس عنوان سے آیا ہے وہ اس وقت تو محض مزاح سمجھا جا سکتا تھا لیکن آج کثرت سے مسلمان ناظرین اس تکلیف دہ طنز کو تعریض سمجھیں گے۔

اردو لفظوں کے ساتھ متعدد ہندی نظمیں بھی ہیں۔ اردو کے بعض مفرد الفاظ کی صحت تلفظ ایک دو لفظ کی صحت، محاوروں اور بعض مرکبات کی صحت ترکیب پر نگاہِ نکتہ چیں دو چار جگہ رکی۔ لیکن جس کتاب کو خواجہ محمد شفیع دہلوی جیسے اہل زبان بے تکلف پاس کر رہے ہوں اس کے کسی مقام پر حرف رکھنا ہے بڑی ہمت و جسارت کی بات۔

(صدق نمبر 45 جلد 12 مؤرخہ 17/ جنوری 1947)

(34) "مسدس بے نظیر"

از جان صاحب ریختی گو۔ مرتبہ محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری
صفحات 130+43، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ چار آنے
اثر رامپوری خسرو باغ روڈ، رامپور، (یوپی)

جان صاحب لکھنوی مشہور ریختی گو کو زمانہ اب بھول چلا تھا۔ اثر رامپوری نے ان کا یہ غیر مطبوعہ مسدس چھاپ کر پھر ان کے نام کو کچھ دن کے لیے پڑھے لکھوں میں زندہ کر دیا۔ اصل نظم تو کل 43 صفحوں میں آگئی ہے، وہ بھی یہ کثرت اور بعض بڑے لمبے حاشیوں کے بعد۔ ورنہ شروع

کے 130 صفحے تو مرتب صاحب کے بڑے پُر معلومات اور مفصل مقدمہ کے لیے وقف ہیں۔

نظم کی شان نزول یہ ہے کہ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور (متوفی 1887) نے جو بڑے گہرے مذہبی اور دیندار ہونے کے ساتھ بڑے زندہ دل و شوقین مزاج بھی تھے اپنے جلوس کی یادگار میں ایک سالانہ میلہ کی طرح ڈالی۔ یہ 22 سال جاری رہا اور رامپور ''دارالسرور'' کے مشہور باغ بے نظیر میں لگتا تھا۔ نواب صاحب کا دربار شاعروں کا ملجا و مرجع تھا اور ان درباری شاعروں میں امیر، امیر مینائی، داغ، جلال کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب (1810 تا 1886) بھی تھے، یہ نظم انہی جان صاحب کی کہی ہوئی اس میلہ کی تعریف میں ہے۔ نظم میلہ قائم ہونے کے دوسرے سال 1866 میں کہی گئی، شاعر کی عمر اس وقت 56 سال کی تھی۔ نظم مسدس کی شکل میں ہے۔ مسدس کا قلمی نسخہ رامپور کے سرکاری کتاب خانہ میں محفوظ تھا، اب 84 سال بعد پہلی بار چھپ کر منظر عام پر آ رہا ہے۔

مسدس یقیناً اپنے زمانہ میں بہت پسند کیا گیا ہوگا اور اس وقت معرکۃ الآرا سمجھا گیا ہوگا۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں اور صفتیں موجود ہیں جن کی قدر لکھنوی شاعری کے اس دور اور اس درباری ماحول میں خاص طور پر ہونا چاہیے تھی۔ وہی زبان، وہی انداز بیان، شاعر کے وہی تیور، شاعری کے وہی ٹھاٹھ اور ریختی کی وہی رعایتیں اور تلازمے۔ ایک بند جو حلوائی کی دوکان سے متعلق ہے ملاحظہ ہو، میٹھی میٹھی باتوں میں رس کس غضب کا گھول دیا ہے:

حلوائیوں کے تھالوں کی کثرت سے جا بجا
دوکان اے ''بی خرما'' ہے ''لکھ پیڑے'' سے سوا
حلوائی ''پوری'' بات بھلا کرنے پائے کیا
اے ''برفی'' جان ہوں جہاں گاہک ہزار ہا
ایسا نہ ہوگا مصر میں بازار وہی گرم
مصری ''بنات'' پوچھ کہ آتی ہے مجھ کو شرم
خوش ہیں ابال ''دودھ'' کی صورت میں لا رہیں
اور کھٹے میٹھے بول بھی اپنے سنا رہیں
ہے عشق تو حسن کا ''ضامن'' بنا رہیں
بالائی بالا دل میں ہیں نقشے جما رہیں

''میٹھی'' زباں ''وہی'' سے سوا ایسی بولی ہے
جو بات گھوسنوں کی ہے ''مکھن کی گولی'' ہے

اسی طرح 103 بندوں میں خدا معلوم کتنے پیشہ وروں، دوکانداروں، گویوں، سازندوں، طائفوں، شاعروں اور عہدیداروں کا ذکر کر گئے ہیں اور میلہ کا پورا نقشہ اپنے شاعرانہ تخیل اور مبالغہ آرائی کے ساتھ کھینچ گئے ہیں۔84 سال کے انقلاب در انقلاب کے بعد نظم میں وہ لطف آج کیسے باقی رہ سکتا تھا۔تاہم مسدس بالکل بے جان اور مردہ آج بھی نہیں کہا جاسکتا اور مرتب نے اپنی والی تو پوری کوشش کرڈالی ہے کہ نظم کو جاندار اول سے آخر تک بنادیں۔

اصل مسدس 43 صفحوں میں آگیا ہے اور وہ بھی مرتب کے بہ کثرت اور خفی قلم کے حاشیوں کے بعد۔باقی 130 صفحہ اثر صاحب کے مقدمہ کی نذر ہیں!۔سن کر بدگمانی نہ کیجیے کہ اتنی ضخامت محض طوالت بیان اور درازنفسی کی کرامت ہے۔ایسا نہیں ہے مرتب نے مقدمہ کو ہر ہر پہلو سے دلچسپ اور زیادہ سے زیادہ پُراز معلومات بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

مرتب کا ادبی ذوق ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے اور ان سے اس کی توقع بیجا نہیں کہ آئندہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس سے بہتر اور برتر کسی کام میں صرف کریں گے، تاہم اگر اسی کا دوسرا ایڈیشن نکالنے کا وہ ارادہ رکھتے ہوں تو معروضات ذیل کو اپنی یادداشت میں کہیں ٹانک لیں:

(1) شاعر کی زبان اب قدرے پرانی ہو چکی ہے اور اس کہنگی کا اثر جا بجا نمایاں ہے۔ مرتب کو ایسے ہر موقع پر حاشیے دینے تھے۔مثلاً ''(رنڈی)'' کا لفظ بار بار آیا ہے۔ اکثر جگہ یہ تشریح ضروری تھی کہ قدیم محاورہ میں یہ طوائف یا کسبی کے معنی میں نہیں۔ بلکہ عورت کے مرادف، روزمرہ کے مقابل تھا۔یا ممدوح کی مدح میں جو یہ مصرعہ ہے ''زیبا ہیں سوا منگیں غلو پر شباب ہے'' (بند 15) یہاں غلو پر یہ نوٹ دینا تھا کہ موجودہ اردو میں یہ لفظ محل مدح پر نہیں۔محل ذم پر آتا ہے۔اسی طرح بالائی بالا (18 بند) پر یہ نوٹ دینا ضروری تھا کہ صحیح ''تلفظ'' بالا ہی بالا ہے، لیکن عورتوں اور عوام کی زبان پر ''بالائی بالا''، علیٰ ہذا اسی بند 75 میں ''ضامن'' پر یہ نوٹ دینا تھا کہ یہ وہ چیز ہے جس سے وہی جمایا جاتا ہے عوام کے تلفظ میں ''جامن'' وغیرہ۔

(2) کہیں کہیں تاریخی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔صفحہ 103 پر شیخ وحید الزماں مرحوم کے حالات درج ہیں ان کا موضع ''چلاداں'' تھانہ کہ ''کربلاواں'' اور اس سے متصل جو

بجنور ہے۔ وہ قصبہ ہے نہ کہ ضلع اور مضافات لکھنؤ میں سے ہے، (مشہور لیڈر چودھری خلیق الزماں کا بھی وطن یہی چاند پور ضلع بجنور ہے)۔

(3) کلام کی شرح میں کہیں کہیں چوک ہوگئی ہے۔ ص:120-127 پر بھنگنوں کے سلسلہ میں ''جھاڑو تارا'' کی تشریح ضروری ہے۔ ''جھاڑو تارا'' عوام اور عورتوں کی بولی میں دُمدار ستارے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ''گوگا'' ایک اصلی یا فرضی شخصیت کا نام ہے جسے مہتر اپنا پیر یا بزرگ مانتے ہیں۔

(صدق جدید، نمبر1، جلد1، 8/دسمبر 1950)

(35) ''اردو''

از جگن ناتھ صاحب آزاد

24 صفحہ، قیمت چھ آنے، دہلی کتاب گھر، دہلی۔

نثر نہیں نظم ہے۔ ایک ہندو شاعر کی زبان سے چند سال قبل کی کہی ہوئی، لیکن حال میں دہرائی ہوئی، شاعر اب لاہوری نہیں 1947 کے خونیں واقعات کے بعد سے دہلوی ہیں۔ اپنا لٹا پٹا تحریری سرمایہ وطن سے لا سکے ہوں یا نہیں لیکن بڑی بات یہ ہے کہ اپنی شرافت کا سرمایہ تمام تر لیتے آئے ہیں۔ کلام آپ سنیں گے؟

سنا ہے ہند پر یوں حکمراں تھی آلِ تیموری
کہ ملک اک جسم تھا اور اس میں جاں تھی آلِ تیموری
یہ تھا دور آدمیت کا شرافت کا مروّت کا
وطن میں یہ زمانہ تھا، زمانہ امن و راحت کا
ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں
کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستان میں پیار کی رسمیں
اکٹھے ہندو، مسلم شریکِ حکمرانی تھے
وطن کے پاسباں مل جل کے محوِ پاسبانی تھے

اللہ اللہ! یہ الفاظ اور یہ خیالات ایک ''شرنارتھی'' کی زبان سے 1950 میں!۔

دوسرا بند ملاحظہ ہو:

ادھر بھی اک تمدن تھا ادھر بھی ایک تمدن تھا
نظر آیا وطن کی سر زمیں پر ایک حسیں نقشہ
نہ کیوں اس گلستان میں ارتقا کے پھول پیدا ہوں
جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدن کار فرما ہوں
جہاں علم پر چمکے مثال کہکشاں ہندی
حکومت کی زباں تھی فارسی، اور ملکی زباں ہندی
عنا دل نغمہ آرا تھے ادب کے گلستانوں میں
اضافہ ہو رہا تھا اس طرح دونوں زبانوں میں

آگے ذکر ہے کہ دونوں سے مل جل کر بلکہ گھل مل کر نئی زبان اردو پیدا ہوئی۔ بند کے بند اگر نقل ہوتے گئے تو کتاب میں پڑھنے کے لیے رہ ہی کیا جائے گا!

کتاب منگا کر پڑھیے اور اسے دوسروں کو سنایئے۔ شاعر کی شرافت اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ چوم چوم لیے جائیں۔

ایک مختصر پیش نامہ قاضی عبدالغفار صاحب کے قلم سے ہے۔

(صدق جدید، نمبر 14، جلد 13، مارچ 1951)

(36) ''روح کلام غالب''

ازمرزا عزیز بیگ صاحب

نظامی پریس، بدایوں۔

کتاب کا نام خود ایک شاعرانہ معمہ ہے اور نام سے کتاب کی نوعیت واضح نہیں ہوتی۔ کتاب دراصل دیوان غالب کی شرح ہے ایک بالکل نئے انداز کی۔ مرزا سہارنپوری مرحوم (متوفی 1920) اپنے استاد سوزاں کے واسطے سے غالب کے شاگرد تھے۔ گو اپنی زندگی میں شعرو شاعری میں کوئی خاص شہرت نہ پائی۔ لیکن ایک کام ایسا عجیب کر گئے جوان کے سوا اور کسی سے نہ بن پڑا۔ کیا کیا کہ غالب کا دیوان سامنے رکھ کر اس کی ہر غزل کو مخمس کر دیا یعنی ہر شعر پر اپنی طرف سے تین تین مصرعوں کی تضمین کر دی۔ کلام غالب کی یہ ایک بالکل اچھوتی خدمت ہے۔

کل غزلیں 136 ہیں جن پر یہ تضمین کی گئی ہے۔ آخر کی دو ایک غزلیں ایسی ہیں جو مطبوعہ

دیوان غالب کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتی ہیں۔ تضمین کوئی آسان کام نہیں اور پھر غالب کے سے نکتہ ور کے کلام کی روح تک پہنچنا اور پھر اس کے رنگ میں ملا دینا تو کار دارد۔ تضمین خمسہ کی جان تیسرا مصرعہ ہوتا ہے اور کم از کم اس تیسرے مصرعہ کی حد تک تو مرزا اکثر کامیاب رہے ہیں۔

نمونہ ملاحظہ ہو غزل 40 ردیف ز زمین جہاں عزیز ایمان عزیز

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز کیوں کر اس بت سے رکھوں جاں عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

مشکل اس کا ہے نکلنا دل سے ہے تعلق بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

شروع میں ایک دلچسپ مقدمہ نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی مرحوم ایڈیٹر ذوالقرنین کے قلم سے ہے اور مرزا مرحوم کے حالاتِ زندگی ان کے ایک عزیز قریب کے قلم سے۔ بہتر یہ ہوتا کہ ان حالات کے ضمن میں مرزا کے کلام کے کچھ نمونے بھی دے دیے گئے ہوتے۔

(صدق نمبر 4 جلد 16 مورخہ 26 رمئی 1950)

(37) ''مثنویاتِ میر بہ خط میر''

مرتبہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے۔ ڈی لٹ
مع پیش لفظ از مولانا ابوالکلام آزاد۔ مع شبیہ حضرت میر۔ قیمت پندرہ روپے۔
دھومی مل دھرم داس۔ چاوڑی بازار، دہلی۔

میر تقی میر کو اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے اس کے لحاظ سے ان کی کوئی سی بھی غیر مطبوعہ چیز آج اگر نظر کے سامنے آجائے تو اردو کے اہلِ ذوق اس پر ٹوٹ کر گریں۔ چہ جائیکہ ان کی پوری ساڑھے تین مثنویاں اور وہ بھی ان کے دستِ خاص کی لکھی ہوئیں!۔ انگریزی کتاب ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے مؤلف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھیں کہیں سے یہ قیمتی ذخیرہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے اسے بجنسہ چھاپ کر وقفِ عام کر دیا۔

مجموعہ تین پوری مثنویوں پر شامل ہے۔

(1) مثنوی عشقیہ۔ صفحہ 1 تا 6

(2) جنگ نامہ آصف الدولہ اور زمینوں کی جنگ کے بیان میں۔ صفحہ 6 تا 8

(3) مثنوی در بیان ہولی صفحہ 9 تا 10

اور چوتھی ایک ناتمام۔

(4) مثنوی در بیان صفحہ 11 تا 12

مجموعہ کی قدر و قیمت بدر جہا بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ یاد کر لیا جائے کہ یہ سارا کلام میر کے اپنے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مرتب نے ایک صفحہ میں بعینہ اس قلمی کلام کا فوٹو دے دیا ہے اور اس کے مقابل صفحہ 155 پر اس کلام کو نستعلیق میں چھپوا دیا ہے اور شروع میں میر کی شبیہ بھی درج کر دی ہے۔ یہ بجائے خود بہتوں کے لیے قابلِ قدر ہوگی۔ یہ شبیہ چڑھی ہوئی گٹھی سیاہ داڑھی کے ساتھ، میر صاحب کے آخر دورِ جوانی کی معلوم ہوتی ہے۔

پیش لفظ جو دراصل اس کتاب پر نہیں بلکہ وہ مرتب صاحب کی دوسری کتاب مرقع شعراء پر ہے اور مرتب صاحب نے اسے دونوں کتابوں میں شامل کر رکھا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے ہے اور یہ خود کتاب کی ندرت میں اضافہ کرنے والا ہے۔ مولانا کی ادبی تحریروں کے دیکھنے کو تو اب آنکھیں ترستی ہی رہتی ہیں۔ پیش لفظ کچھ ایسا مختصر نہیں ہے اور اپنے لکھنے والے کی خصوصیات ادب و انشاء کا پورا مظہر ہے۔ ڈرتے ڈرتے عرض ہے کہ نکتہ چینی کی نگاہ کو ایک لفظ 'علاوہ' کا استعمال 'بجز' یا 'سوا' کے محل پر ذرا کھٹکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ بے احتیاطی اب بہت عام ہو گئی ہے لیکن مولانا کا مرتبۂ ادب و انشاء تو عام لکھنے والوں سے بدر جہا بلند و برتر ہے۔

مرتب صاحب نے صاف شدہ صفحہ پر تحریر میں ترتیب کلام بجنسہٖ وہی رکھی ہے جو اصل میں تھی۔ یہ ٹھیک نہ تھا پڑھنے میں اس سے خاصی دقت پیدا ہو گئی ہے۔ کہاں اٹھارویں صدی کا طرزِ تحریر اور کہاں بیسویں صدی کا! اس وقت لوگ اس الجھے ہوئے طرزِ تحریر کے عادی تھے آج کے پڑھنے والے اس میں خاص الجھن بلکہ دردِ سر محسوس کرتے ہیں۔ صفحوں کے نمبر فہرست مضامین میں تو پڑے ہوئے ہیں خدا معلوم کیسے اصل کتاب کے صفحوں پر پڑنے سے رہ گئے ہیں۔ اس لیے فہرست کچھ بیکار سی ہو کر رہ گئی ہے۔

کتاب عام لوگوں کے زیادہ مطلب کی نہیں لیکن اردو شعر و ادب کے شائقین کے خاص کام

کی ہے اور اردو کے اچھے کتب خانوں کو تو اس کی قدر دانی خصوصیت کے ساتھ کرنی چاہیے۔
(صدق جدید نمبر 45 جلد 7 مورخہ 11 / اکتوبر 1957)

(38) ''دیوان غالب''

مرتبہ مالک رام صاحب ایم اے
359 صفحہ، قیمت ڈیڑھ روپیہ، آزاد کتاب گھر، دہلی۔

غالب کا دیوان خدا معلوم کتنی بار مختلف پریسوں سے اور مختلف طریقوں پر چھپ چکا ہے لیکن اللہ نے کلام کو مقبولیت کچھ ایسی دی ہے کہ ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتا ہی چلا آ رہا ہے اور کھپت سب کی ہو جاتی ہے۔

یہ تازہ ایڈیشن، مشہور غالب شناس مالک رام، ایم اے، کے حسن توجہ اور جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ مرتب کے ستھرے مذاق اور پاکیزہ سلیقۂ تحریر کی طرح چھپائی لکھائی، کاغذ کے اعتبار سے بھی صاف ستھرا نکھرا ہوا۔

اصلاً یہ مبنی اس دیوان غالب پر ہے، جو 1862 میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا۔ لیکن مرتب کی خوش مذاقی اور دیدہ ریزی دونوں نے بعد کے چھپے ہوئے اور مختلف نسخے بھی پیش نظر رکھ کر جا بجا ترمیمیں اس میں روا رکھی ہیں اور اس عمل بالیدگی نے کلام کو صحیح سے بلند کر کے اصح کے درجہ پر رکھ دیا ہے۔ یہ سارے اضافے اور اصلاحیں بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اصل دیوان ص :280 پر ختم ہو گیا۔ غزلیں، قصیدے، رباعیاں وغیرہ سب اس میں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد تتمہ شروع ہوتا ہے یعنی کلام کا وہ نیا حصہ جو مختلف ماخذوں سے لیا گیا ہے اور اس کے اندر بھی غزلیں، قصیدے، قطعے سب ہی کچھ آ گیا ہے۔

یہ نیا حصہ ہر صاحب بصیرت کے لیے خاص طور پر جاذب توجہ ہو سکتا ہے اس کی بہت سی چیزیں بالکل معیاری ہیں اور ٹھیک اسی رنگ کی جس کی توقع غالب سے ہو سکتی تھی، لیکن کچھ چیزیں اس کے برعکس ہیں۔ باکمال سے باکمال انسان بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے۔ فراز کے ساتھ نشیب، چڑھاؤ کے ساتھ اتار، صواب کے ساتھ عیب لازمۂ بشریت ہے اور پھر کچھ حصہ کلام کا تو بہت ہی کم سنی کا ہے۔ یعنی نوجوانی کا نہیں، لڑکپن بلکہ بچپن کا۔ ذہانت اس سن میں روئیں روئیں سے ٹپک رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ذہانت کا رخ تمام تر ''لکھنویت'' کی طرف ہو۔ بچپن کی کہی ہوئی

ایک دس شعری مثنوی پتنگ بازوں کی زبان میں ملاحظہ۔ ہو اس کم سنی میں مرزا نے کیا کیا ہاتھ دکھائے ہیں!:

ایک دن مثل پتنگ کاغذی — لے کے دل سرو بیش آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل ہوائے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہینگے کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان میں الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر، اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑادیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹادیں گے کہیں
دل نے سن کے کانپ کر کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

شروع میں 36 صفحہ کا مقدمہ مرتب کے قلم سے ہر طرح کتاب کے شایان شان ہے۔ کتاب ہر غالب دوست و غالب شناس کی الماری کی زینت بننے کے لیے قابل ہے، غالب کی تصویر اور عکس تحریر گویا مفت میں۔

(صدق جدید، نمبر 49، جلد 8، 7 نومبر 1958)

(39) ''صحرا میں اذان''

از گوپال متل صاحب

112 صفحہ، مجلد 22x18، قیمت چھ روپے،

مکتبہ تحریک 9 انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی۔ 6

متل صاحب سے پہلا تعارف ماہ نامہ 'تحریک' کے واسطے سے ہوا اور دل نے کہا کہ یہ حضرت ہیں کوئی بڑے زبردست پروپیگنڈسٹ قسم کے۔ کمیوزم، کمیونسٹوں کے ہر جرگے کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے اور لوہے کو لوہے سے کاٹنے والے۔ تحریک کے اور کچھ پرچے دیکھے تو

رائے یہ قائم ہوئی کہ ہیں آدمی پڑھے لکھے۔ ذہین بھی، فریس بھی، فہیم بھی یہاں تک کہ اب جوان کا صحیفہ منظومات، غزلیات وارد ہوا حسب معمول جو آنکھ بند کر کے اسے پڑھنے کے لیے کھولا تو اتفاق سے صفحہ 38 اور 40 سامنے آگئے اور دل بغیر انھیں مکرر پڑھے ہوئے نہ مانا اور پھر آپ کو سنا دینے کو چاہا ہے۔ ص 38 پر:

کل شب طلوعِ ماہ کا منظر عجیب تھا
تم جیسے آگئے رخِ زیبا لیے ہوئے

اور صفحہ 40 پر

بقدرِ ظرف ہے جرمِ وفا کی بھی تعزیز
نہیں ہے نصیبِ منصور ہر کسی کے لیے

پلاؤ کی ایک دیگ کا اندازہ باورچی سنا ہے کہ دو ہی چاولوں سے کر لیتے ہیں۔ سیاسیات کے دلدل میں پھنس کر کوئی اپنا ذوقِ سخن اتنا ذوقِ سخن اتنا بلند رکھے جب بھی غنیمت ہے۔

(صدق جدید نمبر 17 جلد 20 مورخہ 27/ مارچ 1970)

(40) ''بزمِ بے تکلف''

از ڈاکٹر سید عابد حسین

قیمت ڈھائی روپیہ۔ سنگم کتاب گھر، دہلی۔

جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے پرانے لکھنے والوں میں ہیں، گاندھی جی کی ''تلاش حق''، ''تاریخ فلسفۂ اسلام'' قسم کے ترجموں کے علاوہ ان کی اپنی لکھی ہوئی چیزیں بھی متعدد ہیں۔ ایک ٹھوس قسم کے اہل قلم وہ ہمیشہ سے ہیں اور بدگمانی یہ تھی کہ ٹھوس ہی نہیں ذرا ''ٹھس'' قسم کے بھی ہیں۔ ان کی ذہانت، ذکاوت اور زندہ دلی کے جوہر تو کہنا چاہیے کہ حال ہی میں یعنی 1947 کے بعد کھلے۔ ان کی قلم کی شوخی جیسے اپنے اظہار کے لیے تقسیم ملک کا انتظار ہی کر رہی تھی! وسط 1948 میں انھوں نے ہفتہ وار نئی روشنی نکالنا شروع کیا جو ''تیل'' کی کمی سے ڈھائی برس بعد بند ہو گیا۔ اور 83 ہفتوں تک بزم بے تکلف کے ماتحت اپنے قلم کی روانی و برجستگی کے جوہر دکھاتے رہے اور یہی مضمون اب یکجا ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

''لائٹ لٹریچر'' کا لفظ ہم نے انگریزوں کی زبان سے سنا۔ اردو میں اس کا صحیح نمونہ دیکھنا ہو

تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور فرمایا جائے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ صحیح ادب لطیف نام نہ فحاشی اور پھکڑ کا ہے۔ نہ رکاکت وابتذال کا نہ اشخاص کی پگڑی اچھالنے کا، اور نہ آورد و تکلف کے ساتھ موٹے موٹے الفاظ اور مشکل ترکیبوں کے جمع کر دینے کا ہے۔ بلکہ یہ تو نام ہے شریفوں کی آپس کی گفتگو کا میٹھی زبان میں صحیح املا و انشاء کے ساتھ جسے سن کر دوسرے ہنسیں مسکرائیں اور ساتھ ہی ساتھ سیکھتے بھی جائیں۔ یہ گفتگو بے تکلف بڑے چھوٹوں سب کے سامنے کی جاسکتی ہے مردانہ میں بھی زنانہ میں بھی۔ اس سے مقصود نہ کسی کو بنانا ہوتا ہے اور نہ اس پر طنز و استہزاء کرنا بلکہ صرف ایک معصومانہ انداز سے دلوں کو خوش کرنا اور کچھ تھوڑی بہت اپنی اصلاح کر لینا۔

ایک آدھ ہلکا سا نمونہ اس ہلکی پھلکی شریفانہ ظرافت کا ملاحظہ کرتے چلیے:

''جب اے بی سی نے بی اے ایل ایل بی ہو کر پبلک لائف میں قدم رکھا تو اس کے ہمدردی کے جذبے کو اپنے اظہار کے لیے اور زیادہ وسیع میدان مل گیا۔ وہ ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے ہاں اللہ کا دیا یعنی اللہ کے غریب بندوں سے لیا ہوا سب کچھ موجود تھا اور انھیں کسب معاش میں جان کھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے دیکھا ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص راعی اور رعایا کے بیچ میں پڑے اور اس بات کی کوشش کرے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ سہی کم از کم اس سے خوش رہیں۔ اے بی سی جانتے تھے کہ دل کو دل سے راہ ہو یا نہ ہو مگر دل کو پیٹ سے ضرور راہ ہے۔ چنانچہ وہ قومی خدمت کے لیے پبلک پلیٹ فارم اور لکھنے کی میز سے زیادہ کھانے کی میز سے کام لیتے۔'' (صفحہ 12 تا 13)

ایک اور موقع اسی سے تقریباً متصل:

''بھائی جان کا نام ان کے عزیز دوستوں میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید ان کی بیوی کے سوا سب ہی لوگ انھیں بھائی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ سچ مچ وہ اپنی طرف سے ہر ایک کے ساتھ بھائی صاحب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے حقہ کو اپنا حقہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسر نفسی کی وجہ سے دوسروں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی ان کے ساتھ اس قسم کا برادرانہ

برتاؤ کریں۔" (صفحہ 13)

زبان کی صحت، صفائی، شستگی کتاب کا ایک نمایاں وصف ہے اور یہ وصف اس دور میں جبکہ بچہ بچہ زبان میں اجتہاد کا مدعی ہے، کوئی معمولی وصف نہیں۔ صحیح، شستہ، رواں، بامحاورہ، بے تکلف زبان لکھنے والوں کی تعداد اب انگلیوں پر گننے والی ہے اور اس کتاب کے مصنف کا نام اب اسی مختصر و منتخب فہرست میں داخل ہونے کے قابل ہے۔ کتاب ادب اردو کے طلبہ کے حق میں ایک نعمت ہے۔

(صدق جدید نمبر 40-17/ ستمبر 1954)

(41) "اپنی موج میں"

از "آوارہ"

120 صفحہ، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپیہ آٹھ آنے، ادارۂ فروغ اردو، امین آباد پارک لکھنؤ۔
(پاکستان میں: مبارک بک ڈپو، بندر روڈ، مقابل ڈنیسو ہال، کراچی۔2)۔

آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن کے ایک کارکن آوارہ مارہروی مدت سے اپنی مزاحیہ تقریریں سناتے رہتے ہیں۔ زبان خصوصاً دہلی کے محاورات کے گویا بادشاہ ہیں اور مزاح کے لفافہ میں پند لطیف بھی، یہ ان کے 26 مزید ارنشریوں کا مجموعہ ہے۔ عنوانات بگڑے رئیس، بیٹر باز، چابک سوار، کرخندار، بانکے، رکابدار، بھٹیاری وغیرہ۔ حرف آغاز مدیر صدق کے قلم سے ہے۔

ظرافت نگاری آسان چیز نہیں، جیسا کہ بہت سے نومشقوں نے سمجھ لیا ہے، فطری مناسبت اس کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بعد پھر قلم اور ذوق دونوں کی پختگی بھی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ جب یہ فطری اور اکتسابی دونوں قسم کی صلاحیتیں جمع ہو جائیں، جب کہیں انسان صحیح معنی میں ظریف ہوسکتا ہے۔ "آوارہ" صاحب میں یہ سارے جوہر موجود ہیں اور اس سب پر اضافہ ان کی حیرت انگیز قدرت زبان کا ہے۔ زبان دانی ان کی اس غضب کی ہے کہ اس پر اچھے اچھے اہل زبان رشک کر سکتے ہیں۔ محاورات پر عبور کامل کے ساتھ ہر فن کے تلازمے اور ہر پیشے کے مخصوص استعارے گویا انھیں نوک زبان ہیں!

اس دل و جگر کا انسان جب لکھنے یا بولنے پر آئے گا تو قدرتاً اپنے قلم اور زبان کی دھاک بٹھا دے گا۔ افسوس ہے کہ بیچارہ خود اشتہاری کے فن سے واقف نہیں، ورنہ آج اس میدان میں

وہی وہ ہوتے۔ ادبیات کے شوقین اور زبان کا چٹخارا لینے والے ناظرین اگر اس کتاب کو ایک نظر دیکھ لیں تو انھیں خود پتہ چل جائے گا کہ تضحیک و تمسخر اور عریانی و فحاشی کے بغیر بھی کوئی تحریر کتنی پر لطف و نشاط انگیز ہو سکتی ہے!

(صدق جدید، نمبر 13، جلد 5، 25 فروری 1955)

(42) ''اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری''

مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب
انجمن ترقی اردو دہلی

برے کے لیے سمجھیے چاہے بھلے کے لیے بہر حال اردو کا سابقہ تو انگریزی کے ساتھ پڑ چکا اور تقدیر الٰہی کا یہ نوشتہ آج سے ڈیڑھ صدی قبل طے ہو چکا کہ اردو خوانوں کو لکھائی اور پڑھائی میں اوسط اور اعلیٰ امتحان میں، بڑی تجارت میں، وکالت میں سرکاری اور نیم سرکاری عہدہ داری میں غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں محتاج اور دست نگر 'صاحب' ہی کی زبان کا ہو کر رہنا پڑے گا۔

حیرت ہے کہ ضرورت اتنی صریح اور واضح پھر بھی اب تک اردو میں کوئی قابل ذکر لغت موجود نہ تھا جس کے سہارے انگریزی زبان کی طویل و عریض الفاظ ہی کی پوری پیمائش ہو سکے۔ انگریزی کنایات، تلمیحات، محاورات، استعارات کا پوری طرح سمجھنا الگ رہا۔ ایک ڈاکٹر فیلن کا لغت البتہ پیش کیا جا سکتا ہے رومن حروف میں چھپا ہوا سو ظاہر ہے انگریزی زبان اتنی مدت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی بعد کے لوگوں نے تھوڑی بہت کوشش کی بھی تو کاروباری نقطۂ نظر سے اور ان کی ہمتیں بھی طلبہ کی محدود ضرورتوں سے آگے نہ بڑھیں۔

ضرورت اور علمی حلقوں میں شدید ضرورت عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھی کہ انگریزی کا کوئی جامع و مبسوط نہ سہی اوسط ہی درجہ کا مفصل لغت اردو میں اور اردو رسم الخط میں موجود ہو۔ مدتیں اسی آرزو میں گزر گئیں تا آنکہ جس جوان ہمت خادم اردو کے نصیب میں یہ سعادت ازل سے لکھی جا چکی تھی اس کے ہاتھوں یہ خدمت انجام پا کر رہی۔ مولوی عبدالحق اور اب ڈاکٹر عبدالحق بی اے، ڈی لٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو نئی دہلی کی خدمات زبان و ادب سے ملک کو روشناس کرانا ''سورج کو چراغ ہے دکھانا'' ایک عمر ہو گئی کہ اپنے کو خدمت اردو کے پیچھے فنا کیے ہوئے ہیں فطرت الٰہی کی معدلت شعاری پر حرف آ جاتا اگر اتنی اہم و عظیم الشان خدمت ان کے سوا کسی اور

کے ہاتھوں انجام پاتی۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری اس وقت انگریزی زبان کا مبسوط ترین جامع ترین مستند ترین لغت ہے۔ اس کا ایک اختصار ''شارٹر'' کے نام سے ہے دو ضخیم مجلدات میں اور پھر اس اختصار کا ایجاز بھی 'کنسائز' کے نام سے نکل چکا ہے۔

اس موجز کے ایجاز کا یہ حال ہے کہ اس کی بھی ضخامت 928 صفحات کی ہے اور ہر صفحہ میں دو کالم جملہ عنوانات مستقل و ضمنی کی تعداد کل ملا کر دو لاکھ کے لگ بھگ پہنچتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی ہمت اس پر مصروف اور اس توجہ پر مستعد ہوگئی کہ اس بحر ذخار کو اردو کے دامن میں سمیٹ لیا جائے!

کام نہ ایک شخص کے کرنے کا اور نہ چند روز میں ہو جانے کا۔ کام کا پھیلاؤ متقضی تھا کہ ایک پوری جماعت اہل علم و تحقیق کی ہوتی جو دوسرے مشاغل سے فارغ اس مقصد کے لیے اپنے کو وقف کر دیتی، ایک عظیم الشان کتب خانہ پاس ہوتا، محرروں، کاتبوں، دفتر کے کارکنوں کا ایک پورا ''منشی خانہ'' مہیا ہوتا جب کہیں جا کر برسوں میں کام کی تکمیل ہو جاتی۔ اردو غریب کے نصیب میں یہ انتظامات کہاں؟ ہمت کا کمال دیکھیے کہ مولوی عبدالحق نے اپنے بیسیوں دوسرے علمی تصنیفی مشاغل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظامت انجمن ترقی اردو ہر دماغی کام کاج کے حق میں زہر قاتل۔ بیرون در Out Door دوڑ دھوپ کے ساتھ اس کام کا بھی بیڑا اٹھا لیا اور وہی چار رفیقوں کی معیت میں اس ہفت خوان کے سفر پر چل کھڑے ہوئے۔ اللہ نے وقت اور ہمت میں برکت دی رفیق دو ہی ایک سہی مگر خوب کام کے نکلے خصوصاً جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر عابد حسین۔ نتیجہ اس کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس پر تبصرہ کی یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

کتاب کا نام اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری ہے ضخامت لمبی چوڑی تقطیع کے 1512 صفحات۔ اور کوئی 25 صفحے دو ضمیموں کے اور 6 صفحوں کا دیباچہ کل ضخامت گویا 1550 صفحات کی۔ ہر صفحہ میں دو کالم، اردو کی چھپائی ٹائپ کی ٹائپ جلی نہیں خفی ہے اس لیے گنجائش بہت زائد نکل آئی۔ کاغذ اہتمام کے ساتھ باریک رکھا گیا اس لیے کتاب ایک جلد میں آ گئی ورنہ حقیقت مسالہ پڑھنے کا اتنا ہے کہ دو مجلدات سے کم کفایت نہ کرتا۔ دیباچہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے ایک طرف فاضل مرتب کی کوششوں اور کاوشوں کا کچھ اندازہ ہوگا اور دوسری طرف کتاب کی کچھ خصوصیات بھی روشنی میں آ جائیں گی:

> ''کہنے کو تو یہ نظر ثانی تھی لیکن حقیقت میں از سر نو ترجمہ کرنا پڑا، شاید ہی کوئی لفظ ہوگا جو حک و اصلاح سے بچا ہو۔ بڑی احتیاط یہ کی گئی کہ انگریزی لفظ کے لیے

اردو لفظ، انگریزی محاورہ یا روزمرہ کے لیے اردو محاورہ یا روزمرّہ انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اسی طرح بٹھائی جائے کہ انگریزی کا پورا مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔ لفظ کی تشریح تو آسان ہے لیکن لفظ کے لیے ویسا ہی لفظ اور محاورہ کے لیے ویسا ہی محاورہ لانا مشکل کام ہے۔ بعض اوقات ایک ایک لفظ کے لیے بیسیوں کتابوں کے ورق الٹنے پڑتے تھے بول چال یا عامیانہ الفاظ کے لیے اردو میں بھی اسی قسم کے الفاظ تلاش کرنا پڑتے تھے۔ علمی اصطلاحوں کے لیے پیشہ وروں کی اصطلاحیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لانا پڑتی تھیں۔ ایسی صورتوں میں اکثر کتابیں کام نہیں دیتی تھیں۔

اسی طرح انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو کے مترادف الفاظ سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں ہر معنی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف ظاہر ہو جائے اور ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ محض تشریح کر دینے سے نہ تو پورا مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال معلوم ہوتا ہے۔'' (دیباچہ ص5)

کام کی نزاکت اور دشواری کا اندازہ پڑھنے والے کو نہیں لکھنے والوں میں بھی صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں خود کبھی ایک آدھ صفحہ لغت کے کام کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم عام ناظرین بھی کام کی وسعت و عظمت کا کچھ تو اندازہ کر ہی سکتے ہیں۔ اس لیے ایک آدھ نمونہ ملاخطہ ہو۔ انگریزی میں ایک آسان لفظ About ہے۔

اس ایک ہلکے اور سادہ لفظ کے دیکھیے کتنے معنی اور پہلو نکلتے ہیں۔

(1) اطراف میں چاروں طرف

(2) کسی مرکز کے گرداگرد جیسے اپنے اردگرد

(3) کسی طرف، کسی رخ، آس پاس، دروازہ کے آس پاس رہنا

(4) یہاں، وہاں، ادھر، اُدھر، جابجا، ہر کہیں

(5) کم و بیش، تخمیناً، تقریباً، لگ بھگ۔ (تعداد، پیمانہ یا درجہ کے اعتبار سے)

(6) پھر کر۔ گھوم کر۔ پلٹ کر۔

(7) چاروں طرف۔ مخاطب ہو کر۔ ہر طرف پھر کر

(8) مشغول، مصروف، فکر میں

(9) متعلق بہ۔ بابت؛ نسبت۔ بارے میں

(10) گھوم کر، چکر کاٹ کر۔ پھیر دے کر۔ گھوم گھام کر۔

(11) عنقریب، بالکل بھی۔ تقریباً (ص:4)

اس لفظ کے اصلی اور ابتدائی معنی تو وہی ہیں جو نمبر اول پر درج ہیں باقی فقرہ میں دوسرے لفظوں کی ترکیب و امتزاج کے ساتھ محاورہ میں جو جو مفہوم پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کی تشریح نمبر 2 سے نمبر 11 تک بیان ہوئی۔ اصل کتاب میں ان سب کے مقابل انگریزی کے بھی پورے پورے فقرے درج ہیں۔ یہاں نقل میں انھیں حذف کر دیا گیا ہے کہ انگریزی عبارتوں کی چھپائی اردو اخبار میں آسان نہیں۔

ایک مثال تفحص و جامعیت کی اور دیکھتے چلیے انگریزی کا ایک لفظ Pole ہے جس کے دو معنی ہیں ایک عام اور دوسرے اصطلاحی۔ اور پہلے معنی میں وہ عموماً بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی بطور فعل متعدی بھی۔ اب اس لغت میں اس کے دونوں معنی عمومی اور اصطلاحی ملاحظہ ہوں۔ انگریزی لفظ کا عنوان مکرر دیا گیا ہے۔ عنوان اول کے تحت میں:

(1) بانس۔ بلّی (خیمہ)۔ چوب۔ تار کا کھمبا

(2) گاڑی کا بم

(3) پول۔ ڈنڈا وغیرہ بطور پیمانہ ساڑھے پانچ گز

(4) بانس یا بلّی کے ذریعہ ڈھکیلنا یا سرکانا

اور عنوان ثانی کے تحت میں:

(1) قطب (شمالی یا جنوبی) محور ارض کا (شمالی یا جنوبی) نقطہ جس کے گرد ستارے گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

(2) (ہندسہ) کسی کرہ کے دو دو نقطے جن پر کوئی دوسرا اس کرہ کو قطع کرتا ہے۔ قطبین کرہ

(3) کوئی قائم نقطہ جس کی نسبت سے اور نقطوں کے محل کا تعین کیا جائے۔ نقطۂ قائمہ

(4) (جمع) مقناطین کے دو مقابل نقطے یا مقناطیسی قوت کے مرکز۔ قطبین مقناطیسی

(5) برقی کارخانے یا مورچے کے منفی اور مثبت سرے

(6) (حیاتیات) کسی کروی یا بیضوی عضو کے محور کا سرا

(7) مجازاً (جمع) ایک دوسرے سے متضاد اصول۔ اضداد

مقابل کے انگریزی فقرے یہاں بھی نقل میں نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ ساری کتاب اول سے آخر تک تلاش و کاوش، جامعیت و ہر جہتی کے اسی رنگ میں لکھی گئی ہے اور مستقبل کے اردو مترجمین انگریزی کے لیے راستہ اس حد تک صاف کر دیا گیا ہے کہ اس کتاب کے قبل اس کا تصور بھی مشکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ الفاظ کی تشریح و تحقیق کے نمونے کے لیے تو یہ مثالیں بالکل کافی ہوں گی لیکن فاضل مرتب کا ایک اور کمال یہ ہے کہ حتی الامکان انگریزی ضرب المثل کے مقابل اردو ضرب المثل اور انگریزی محاورہ کے مقابلہ میں اردو محاورہ کا التزام رکھا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے "As stiff as a poker" لفظی معنی ہیں ''ایسا سخت جیسے آگ کریدنے والی سلاخ'' لیکن اس لغت میں اس کے بجائے آپ کو اردو کی ایک مثل ملے گی ''ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا ہوا'' ص 882 یا انگریزی فقرہ Make no sign کے لیے ''ٹس سے مس نہ ہونا'' ص 113۔

کتاب کی اصل غایت انگریزی خواں حلقہ میں اردو کی خدمت کرنا اور اس کو نفع پہنچانا ہے لیکن کتاب صرف انہی لوگوں کی راہ ہموار نہیں کرتی جو اردو میں انگریزی خیالات کو ترجمہ و تالیف کے ذریعہ لانا چاہتے اور انگریزی تحریر و تقریر کو سمجھنا چاہتے ہیں بلکہ اس کتاب نے اردو میں بجائے خود ہی الگ سے نئے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ اس لیے کہ انگریزی الفاظ کی توضیح و تشریح میں مرتب نے محض موجودہ فرہنگ الفاظ پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ جا بجا نئے الفاظ بھی اپنی طرف سے تراشتے اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرتے گئے ہیں۔ عموماً ایسے الفاظ قوسین کے اندر 'درج' (مخفف جدید) کے اضافہ سے پہچان لیے جاتے ہیں اس قسم کے بھی چند نمونے ملاحظہ ہوں:

Impressionable کے لیے 'زود تاثیر' ص 566 ک۔2

Colour blind کے لیے رنگو دھا۔ رنگندھا (رنگ۔ اندھا) ص 206 ک۔1

Absentee کے لیے ''غائب باش'' ص 50 ک۔1

Ard Yark کے لیے 'گھونسور'۔ زمینخوک (زمین خوک) ص 1۔ک 1

لغت اردو خوانوں کے لیے انگریزی الفاظ کے معانی کا آئینہ دار ہے اس لیے قدرتاً انگریزی الفاظ کے تلفظ سے اسے سروکار نہیں، تاہم جو الفاظ فرنچ، لاطینی وغیرہ کے انگریزی میں گھل مل گئے ہیں اس تقریب سے اس لغت میں بھی جگہ پا گئے ہیں۔

(صدق نمبر 10 جلد نمبر 6 مو[illegible] 16 جولا[illegible] 1[illegible])

(43) ''پرچھائیں''

از جناب آصف علی صاحب

91 صفحہ، 12x18 سائز، مجلد مع گرد پوش، قیمت درج نہیں۔

انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آصف علی صاحب اس وقت ہندوستان کے اس صوبہ کے گورنر ہیں اور ہزا کسیلنسی ہیں۔ کسی زمانہ میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور ایک اونچے سیاسی لیڈر تھے۔ اس سے بھی قبل دلی کے ایک نامور بیرسٹر تھے اور کوچہ چیلان میں کامریڈ و ہمدرد والے محمد علیؒ کے رفیق اور پڑوسی۔ ادب و شعر سے ذوق انھیں عمر کی ہر منزل میں رہا۔ کبھی کبھار کچھ لکھتے لکھاتے بھی رہے۔ مستقل مصنف کی حیثیت سے شاید پہلی بار اب نمودار ہوتے ہیں۔ تصنیف زمانۂ گورنری کی نہیں، دور اسیری کی ہے۔ اس وقت کی جب 1942 کے ہنگامہ رستخیز میں وہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ اسیر فرنگ کی حیثیت سے، قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے۔ قلب کے سوز و گداز کو اور قلم کے درد و تاثر کو ایوان گورنری کے جاہ و حشم سے بھلا مناسبت ہی کیا؟ اس کے لیے موزوں فضا تو جیل کی چار دیواری اور مناسب ماحول نظر بندی کی وحشت سامانی ہی ہے۔

کتاب کچھ نثر میں ہے کچھ نظم میں، اور نظم سے مراد نظم غیر مقفٰی ہے اور کہیں کہیں نثر شاید غیر ارادی طور پر نظم کے سانچہ میں ڈھل گئی اور شعر بن گئی ہے۔ مثلاً:

''اپنی کہتی ہو، سنو اور کی بھی''

تم پہ جو بیتی وہ پرچھائیں تھی۔

اور پرچھائیں بھی کچھ دھندلی سی۔

تم کلی پھول وہاں دیکھا کیں

موت یاں زیست سے تھرّاتی تھی۔

تم مہک سونگھ کے خوش ہوتی تھیں۔ (ص:54)

یہ مصرعے نہیں ہیں۔ کتاب کی سطریں ہیں۔ ہر سطر الگ لکھی ہوئی، گو بجائے پیرا گراف کے ہر ہر سطر خود پیرا گراف!۔ کتابت کی یہی شان شروع سے آخر تک قائم۔

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''رات کا سناٹا ہے۔ تارے بھی چپ ہیں''

چاندنی کروٹ لے کر سوگئی۔

جگنو پھولوں کی طرح طرح کھل کھل کر مرجھا جاتے ہیں۔

تمھارا خیال رہ رہ کر درد کی طرح کسکتا ہے۔

کس نے روک رکھا ہے، جو نہیں آئے؟

امیدوں کے تیر چلاتے رہتے ہو۔ (ص:20)

25، 30 سال ادھر ''ٹیگوری اردو'' کا زور ہوا تھا۔ مدت کے بعد اس کے نمونے کو پہلے سے یقیناً کہیں بہتر، اب نظر آئے۔

نظم جہاں تک ترنم کا تعلق ہے۔ یقیناً بڑی رواں اور پر کیف۔ نثر بھی جہاں تک لفظ و عبارت کا تعلق ہے، بڑی حسین و جمیل۔ ماشاء اللہ دہلی کے۔ اردو ان کے گھر کی زبان۔ اس پر مستزاد کہ وہ زمانہ دیکھے ہوئے ہر گرم و سرد۔ نشیب و فراز کا مزہ چکھے ہوئے زبان کے ادیب اور شاعر۔ دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ماہر، کلام ان کا نہ بلند و بلیغ ہوگا تو اور کس کا ہوگا۔ معنویت ان کے الفاظ کی بلائیں لیتی ہوئی نہ ملے گی تو اور کہاں ملے گی۔ یہ سب کچھ ہوگا، بلکہ اس سے بھی بہت کچھ زائد ہوگا۔ لیکن بعید الفہم قاری اپنے نصیب کی محرومی کا شکوہ کس سے کرے۔ کہ کتاب جب پڑھ لی تو نظر یہ آیا کہ اپنے پلّے کچھ پڑا ہی نہیں اور ہاتھ محض سایہ ہی رہا، پرچھائیں پھر پرچھائیں! اور پرچھائیں نویس عالم باعمل! مغل شاعر کا اردو شعر:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

گویا مرقع چغتائی نثر میں!

(صدق جدید، نمبر 1، جلد 19 / جنوری 1951)

(44) ''آتش خموش''

از خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری

صفحہ 204 مجلد مع گرد پوش۔ قیمت پانچ روپے، بک لینڈ، مال روڈ، لاہور (پاکستان)

خواجہ محمد شفیع بحیثیت ناول نویس ملک کے لیے کوئی نامانوس یا غیر معروف ہستی نہیں۔ ہجرت

لاہور کے بعد سے البتہ اس حیثیت سے خاموش ہو گئے تھے۔ آتش خموش ان کی اس خاموشی یا نیم گمنامی کے دور کو ختم کرنے والی ہے۔ خواجہ شفیع انشا پرداز و اہلِ زبان پہلے ہیں اور ناول نویس بعد کو لکھنؤ کے سرشار کی طرح لیکن یہ نہیں کہ سرشار کی طرح وہ زبان، محاورہ اور روزمرہ ہی کے رہیں اور اس رو میں یہ خیال ہی نہ کریں کہ پلاٹ کی چولیں کتنی ڈھیلی پر ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ نہیں، انھیں خیال پلاٹ کی چستی کا بھی رہتا ہے اور اشخاص قصہ کی شخصیتوں (یا بہ اصطلاحِ حال 'کرداروں') کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں رہتے۔ البتہ نمبر اول پر اہتمام ان کے ہاں زبان ہی کا ہے۔ اور ضرور نہیں کہ اس اہتمام میں دخل ان کے قصد اور ارادے کو بھی ہو۔ لغت، معانی و بیان کی کسی کتاب کی ورق گردانی نہ کی۔ ان کے کسی ناول ہی کا کوئی صفحہ ذرا غور کر کے پڑھنا شروع کر دیا وہی کافی ہو جائے گا۔ اس ناول کا پلاٹ مجلسی زندگی کا ہے اور وہی حسن و عشق جو ہر ناول کی جان ہوتا ہے۔ دل کی بے تکلف زندگیوں کا مرقع۔ کہیں واہ کہیں آہ، کہیں سوز کہیں ساز، کہیں غفلتیں کہیں عبرتیں، کہیں قہقہوں اور تالیوں کا زور، کہیں نالہ و ماتم کا شور، قصہ کی حلاوت قصہ پڑھنے والے ہی کے حصے میں آسکتی ہے۔ اخلاقی سبق ہلکے ہلکے کتاب بھر میں بکھرے ہوئے البتہ نذیر احمد و راشد الخیری کی طرح سر پر مسلط نہیں۔ بکی پلاٹ سادہ نہیں۔ خاصا پیچیدہ اور پر اسرار ہے۔ رازوں سے پردہ کہیں بالکل آخر میں جا کر اٹھتا ہے اور اس سے بڑھ کر نئی بات یہ کہ اب کی نری بزم آرائی نہیں بلکہ رزم بھی شامل بزم ہو گئی ہے اور آخر میں تو شبہ یہ ہونے لگتا ہے کہ جیسے کوئی جاسوسی ناول کسی روپوش یا under ground دہشت پسند سے متعلق کھلا ہوا ہے! (اس انگریزی لفظ کا ترجمہ خدا کے لیے کوئی صاحب "زمین دوز" نہ کر گزریں۔ یہ قدیم "روپوشی" کے لیے جدید اصطلاح ہے!)۔ سب سے بڑھ کر آئی گئی دہلی کے ایک ادھیڑ سن کے حکیم پر ملتی ہے۔

طرز ادا کا نمونہ دیکھنا ہو تو کتاب کا ایک صفحہ درمیان سے پڑھتے چلیے:

"برسات کا موسم۔ امنگوں کے دن۔ کالی کالی بدلیاں سیاہ کاریوں پر آمادہ کریں۔ رم جھم رم جھم مینہ برسے۔ پیا ملن کا جیوڑا اترسے۔ اس موسم میں بوڑھے جوان کی تخصیص نہیں۔ بدلی آئی اور نیت بدلی۔ اپنی اپنی توفیق کے مطابق سب کھل کھیلتے ہیں۔ حکیم صاحب کا تو پوچھنا ہی کیا۔ کشتوں کی خشکی میں لگی جو برسات کی بھیگی بھیگی ہوا تو بے آپے ہو گئے۔ اور تر دامنی پر آمادہ۔ دل کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اگر کسی پر طبیعت آجائے اور دل کو

بھا جائے تو کسی اور سے دل بہلتا نہیں۔ حکیم صاحب نے ایک دو بار زیر علاج طوائفوں کو بلایا۔ باغ میں جلسہ جمایا۔ پر کچھ دل خوش نہ ہوا۔ بوتلیں لنڈھائیں پر طبیعت تشنہ کام ہی رہی۔ نگاہیں کسی اور ہی کو ڈھونڈتی تھیں۔ ایک مریض نے جلسہ دیا۔ لالہ صاحب کے باغ میں انتظام ہوا۔ کڑھائی چڑھی ہوئی ہے۔ جھولے پڑے ہیں۔ آموں کی ناندیں بھری رکھی ہیں۔ دو چار گلعذار جمع۔ سب احباب موجود طبلہ کھڑک رہا ہے۔ مینہ برس رہا ہے۔ ملہار گائے جا رہے ہیں، پینگ بڑھ رہے ہیں۔ کپڑے جسم پر چپکے جا رہے ہیں۔ پھول سے جسم جھلک رہے ہیں۔ پیمانہ ہائے عیش چھلک رہے ہیں"۔ (ص:124)

جا بجا خواجہ صاحب جہاں لکھنویت پر اتر آئے ہیں، وہاں اچھے اچھے لکھنویوں کو مات دے دی ہے۔ ایک نمونہ اس رنگ کا بھی ملاحظہ ہو۔ حکیم صاحب کے مصاحب خاص ایک "ولایت پلٹ" ماسٹر صاحب ہیں۔ بات چیت ان سے تخلیہ میں ہو رہی ہے:

"حضور کے اقبال سے ایسی سوجھی ہے کہ جواب نہیں۔ اول کشمیری دماغ۔ پھر ولایت کا سلجھا ہوا وہاں کی ہوا میں عقل و شعور ہے بڑے کہہ گئے ہیں دانایان فرنگ۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔ حکیم صاحب بولے ایک دن کا واقعہ شب فردا پر اٹھا رکھیے پہلے تدبیر بتایئے۔ اس پر ماسٹر صاحب مقدمہ جیتے ہوئے بیرسٹر کی ادا سے مسکرا کر بولے۔ اجی تدبیر کو کیا پوچھتے ہیں آپ۔ نو تولہ باون رتی کی ہے۔ بس سنتے ہی تڑپ جائیے گا بھڑک جائیے گا۔ یہ کوڑی کبھی پٹ پڑی ہی نہیں۔ ان قدموں کی قسم بڑی دور کی کوڑی لایا ہوں۔ لاکھوں کا کام کوڑیوں میں بناتا ہوں۔ کوڑیاں لے کر افعی سے لڑاتا ہوں۔ کوڑی کے چار سودے بتاتا ہوں۔ اور پھر کوڑی بچا لاتا ہوں۔ بس یوں سمجھیے کہ پھوٹی کوڑی کے کوڑے کر لاتا ہوں۔ حکیم صاحب جھلا کر بولے یہ ضلع جگت کب تک بولیے گا۔ معاملہ کی بات کیجیے"۔ (صفحہ 213)

افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیاں بڑی کثرت سے رہ گئی ہیں۔ تبصرہ کا جو نسخہ موصول ہوا ہے وہ مصنف کے ہاتھ کا اصلاح شدہ ہے۔ اس پر بھی غلطیاں افراط سے موجود۔ "عندیہ" کا املا ہر جگہ "اندیہ" "بہ این ریش فش" کے بجائے "بہ مع اش دفش" صفحہ 126۔ "وہی" کے بجائے "وہ ہی" (صفحہ 443)

ایک عرض اور بھی دبی زبان سے کرنے کی ہے۔ گو وہ ایک اہلِ زبان اور زمانے ہوئے ادیب کی شان میں ہے، بہت گستاخانہ۔ یہ پریس اور سینما سلامت رہیں۔ اس دور میں اہلِ زبان کو بھی اپنی زبان کی صحت قائم رکھنا دشوار ہو گئی ہے۔ تاوقتیکہ اس کا وہ اہتمام خاص نہ رکھیں اور اپنے کو گنواروں کی صحبت سے تمام تر محفوظ رکھیں۔ ''گنوار'' یہاں دہقانی کے معنی میں نہیں۔ بلکہ جس کسی کی بھی زبان چوپٹ ہے وہ گنوار ہی کے حکم میں داخل ہے۔ پڑھنے بولنے اور سننے میں چوبیسوں گھنٹے اس شدت سے غلط الفاظ غلط ترکیبیں آتی رہتی ہیں کہ اہلِ زبان بیچارے خود مخبوط و مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

''موسیقار'' کا استعمال بجائے ایک پرند کے ''گویے'' کے معنی میں تو فلمی اشتہاریوں کی زبان ہے اور 'ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا' تو تمامتر ایک فرنگی محاورہ کا ترجمہ ہے جب ایسی چیزیں بھی اس کتاب میں بار پا جائیں تو اب سند و استناد کے آخری مرجع کے لیے کوئی بتائے کہ کون سا آستانہ تلاش کیا جائے۔

صفحہ 189 پر ایک شعر بھی نکتہ چینی کی آنکھ کو کھٹکا۔ غالب کی غزل ''بر نہیں آتی''، ''نظر نہیں آتی'' اوپر سے چلی آ رہی تھی یک بیک ایک شعر اسی وزن و ردیف کا مگر بالکل دوسرے قافیہ کا اس میں کیسے آ گیا ہے۔

خواجہ کی ادبیت کے قدردانوں کو اپنی قدردانی کا تازہ ثبوت خواجہ کی اس تازہ پیش کش کے لیے بھی ضرور دینا چاہیے۔

(صدق جدید نمبر 38 جلد 7 مورخہ 23 / اگست 1957)

(45) ''توبۃ النصوح''

(یہ نشریہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کے مشہور ناول توبۃ النصوح پر 14 دسمبر 1950 میں نشر کیا اور اس سبق آموز اخلاقی ناول پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مولانا مولوی نذیر احمد صاحب کی زبان دانی اور کردار نگاری کے بڑے قائل تھے۔)

یہ نصوح وہ نہیں، جن کے توبہ کا ذکر مولانائے روم نے آج سے سات صدی قبل اپنی مثنوی میں فرمایا ہے:

بود مردے پیش ازیں نامش نصوح

بلکہ یہ نصوح آپ کے ہم وطن تھے، خاص دیس کی راجدھانی شہر دہلی کے رہنے والے اور انھیں زمانہ بھی کچھ ایسا زائد نہیں گزرا۔ عجب نہیں جو ہمارے آپ کے دادا نانا کے ہم عصر ہوں۔ کل اسی بیاسی ہی برس تو ہوئے۔ واقعی گوشت پوست کے بنے ہوئے اس نام کے اور ایک خاص حلیہ کے کوئی صاحب تھے بھی یا نہیں، یہ بحث تو مؤرخ وسوانح نگار کے لیے چھوڑیے۔ ادب کا طالب علم اور کتاب کا تبصرہ نگار تو بس اتنا جانتا ہے کہ دہلی کے ایک ادیب وفسانہ نگار اور واعظ شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد نے ان نصوح کی تخلیق 1870 کے لگ بھگ کی تھی اور اتنا جان لینا کافی ہے اس کہانی کے سننے والوں کے لیے بھی اور سنانے والوں کے لیے بھی۔ یہ نصوح ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش باش شہری تھے۔ بیوی بچوں والے اور ادھیڑ عمر کے۔

ایک بار کیا ہوا کہ شہر میں ہیضہ کا زور ہوا۔ لوگ تابڑ توڑ مرنے اور گزرنے لگے دوائیں اور تدبیریں رکھی کی رکھی رہ گئیں۔ مرض کا حملہ میاں نصوح پر بھی زور کا ہوا۔ حالت بگڑی اور لوگ مایوس ہو گئے۔ ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی اور ان پر مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اس حالت میں اپنے کو دیکھتے کیا ہیں کہ اس دنیا سے گزر کر عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں اور اعمال کی پرسش ہو رہی ہے۔ آخرت کا یہ منظر، خواب وخیال میں سہی، بہر حال قیامت کا منظر ہے اور ادب میں مثنوی زہر عشق میں نواب مرزا شوق کی تراوش فکر وصیت نامہ'' کا جواب۔ نقشہ نذیر احمد کے قلم نے اس درجہ مؤثر اور دل ہلا دینے والا پیش کیا ہے کہ تندرست اور ہٹا کٹا جوان بھی غیر متاثر نہیں رہ سکتا، چہ جائیکہ نصوح جو ضعف اور بیماری سے گھل کر نیم جان ہو ہی چکے تھے۔ جب آنکھ کھلی تو دل سے اپنی بے عملی پر نادم اور بد عملی سے تائب تھے اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی کے اصلاحی انقلاب پر پکے ارادے اور اٹل فیصلہ کے ساتھ کمر بستہ۔ غفلت اور سرشاری کی جگہ اب عقل کی بیداری اور روح کی سرگرمی نے لی۔ اصلاح پہلے اپنی کی۔ پھر اپنی شریک زندگی بی فہمیدہ کی کی۔ لڑکیاں دو تھیں اور لڑکے تین۔ ان میں سے چھوٹی لڑکی اور چھوٹے لڑکے کو تو جلد ہی درست کر لیا۔ منجھلا لڑکا بھی قابو میں آ گیا۔ ٹیڑھی کھیر دو اولادیں ثابت ہوئیں، ایک بڑی اور شادی شدہ لڑکی نعیمہ، دوسرے جوان جہان صاحبزادے کلیم۔ سب سے زیادہ دلچسپ مفصل اور عبرت آموز سرگزشت انہی میاں کلیم کی ہے اور نذیر احمد کے قلم کا اصل جوہر انہی کی کردار نگاری میں چمکا ہے۔ باپ نے بار بار بلا بھیجا، مگر یہ صاحبزادے ایسے سعید تھے کہ گئے نہیں اور اس کے بعد باپ نے جو پند نامہ اور ملامت

نامہ لکھا، بس اسی کو بہانہ بنا اپنی شاعری اور شوقین مزاجی کی ترنگ میں آ، گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔

اب نصوح نے ان کمروں کی تلاشی لینی شروع کی اور چلیے ہم آپ بھی تلاشی کے گواہ بن جائیں۔ کمرے دو ہیں۔ ایک عشرت منزل یا آج کی زبان میں ڈرائنگ روم دوسرا خلوت خانہ یا آج کی بول چال میں بیڈ روم پہلے عشرت منزل ہی پڑتا ہے۔ کمرہ کیا تھا۔

"ایک تکلف خانہ تھا۔ کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش، اس پر دری۔ اس پر سفید چاندنی، اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا، گاؤ تکیہ لگا ہوا، سامنے اگالدان۔ لب قالین پیچوان چوکیوں کے گرداگرد کرسیاں، تھیں تو لکڑی کی، لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی چھت میں پٹا پٹی کو گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا، اس کے پہلوؤں میں جھاڑ۔ جھاڑوں کے بیچ میں رنگا رنگ کی ہانڈیاں، چھت کیا تھی، بلامبالغہ آسمان کا نمونہ تھا، جس میں پنکھا بجائے کہکشاں کے تھا، جھاڑ بمنزلہ آفتاب اور ماہتاب، اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے۔ چھت کے مناسب حالت دیواریں اور تصویروں اور قطعات اور دیوار گیریوں سے آراستہ تھیں، مقابل صدر کی جانب آمنے سامنے دو میزیں لگی ہوئی، ایک پر گنجیفہ، شطرنج، چوسر، تاش، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے ہوئے۔ دوسری پر گل دان اور عطردان وغیرہ ے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب، تصویروں کا البم، مگر تصویریں کسی عالم، حافظ، درویش، خدا پرست کی نہیں، مکھوا پکھاوجی، تان رس خاں گویا، میر ناصر احمد بین نواز، صمد خاں پہلوان، کھلونا بھانڈ، حیدر علی قوال، نتھو ہجڑا۔ قاری علی محمد پھکڑ، بدو جواری اس قسم کے لوگوں کی، دیوار والی تصویریں تو اور بھی بیہودہ۔"

دنیا نے 1870 میں اتنی ترقی کہاں کی تھی کہ ایکٹرسوں اور فلم اسٹاروں کی تصویریں غسل اور پیراکی کے لباس والیوں کے فوٹو، اور BEAUTY QUEEN (حسن کی ملکاؤں) کے مرقعے، اس نگار خانے میں موجود ہوتے۔ بہر حال جو فرنیچر اور جو سامان آج سے اَسّی سال قبل کی روشن خیالی اور آرٹ نوازی کے لیے مایۂ زینت ہو سکتا تھا، کمرہ عشرت منزل اس سے مکمل طور پر آراستہ تھا۔ لیکن لیجیے اسی ایک کمرہ کا جائزہ لینے میں اتنی دیر ہوگئی کہ خلوت خانہ کی سیر کا وقت ہی نکلا جاتا ہے۔ خیر ایک اچٹتی سی نظر اس پر بھی سہی۔ یہاں ایک الماری کتابوں کی تھی۔ کتابیں ظاہر کے اعتبار سے ہر صناعی او... ہنرمندی کا نمونہ لیکن۔

"معنی ومطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی، جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔"

نصوح نے کیا کیا کہ "بھری الماری کتابیں لکڑی اور اپلے کی طرح اوپر تلے رکھ کر آگ لگادی" اور دم کے دم میں کلیات آتش کو دہکتی آگ اور دیوان شرر کو جلتے انگاروں اور واسوخت امانت کو آتش سوزاں کے سپرد کر دیا"۔ آج کے اہل بزم ان کتابوں کے نام پر کچھ زیادہ حیران اور چوکنا نہ ہوں۔ وقت کا معیار ثقاہت ومتانت یہی تھا۔

کلیم بیچارہ شامت کا مارا شعر وشاعری کے نشہ میں دھت، خود بینی وخود پسندی کی شراب سے مست، رات کے وقتِ گھر سے نکلا تو سیدھا اپنے بے فکرے دوست، مرزا ظاہر دار بیگ کے ہاں پہنچا۔ یہ حضرت اسم بامسمّیٰ تھے، ظاہر داری کے فن میں طاق، ڈھول کی رسی بٹنے کے کمال میں مشاق، ان کی چھب تختی بھی قابل دید ہے۔ مزیداری میں نواب مرزا شوق کی مثنوی کی مہری کی کنگھی چوٹی سے کم نہیں۔

"جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی۔ سر پر آڑی بیل کی کامدانی ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگر کھے، اوپر شبنم یا ہلکی تنزیب، نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل لگی ہوئی، سرخ نیفہ، پائجامہ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض جب دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔"

یہ مرزا اپنی امارت کے خوب خوب ہوائی قلعے بناتے اور کلیم پر اپنی دھونس جماتے رہتے۔ کلیم بھولا بھالا بھی ان کی لن ترانیوں میں آ گیا تھا۔ پہنچا سیدھا ان کی حویلی پر معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کی دولت سرا اس حویلی کے پچھواڑے ہے۔ ایک تو اپلوں کی ٹال کے پاس ایک چھوٹا سا مکان اور وہ بھی کچا۔ آواز سن کر مرزا ننگ دھڑنگ جانگھیا پہنے باہر تشریف لائے اور معا بولے کہ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ کلیم بولے کہ میں تو آپ کے پاس رات کو رہنے کی نیت

سے آیا ہوں۔ مرزا نے برجستہ کہا کہ چلیے اس مسجد میں تشریف رکھیے نہ۔ بڑی فضا کی جگہ ہے اب اسی مسجد کا نقشہ نذیر احمد کی انشا میں یہ ہے:

''ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد مسجد ضرار کی طرح ویران، وحشت ناک نہ کوئی حافظ نہ کوئی ملا۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔''

مرزا کلیم کو یہ بتا دے کر کہ گھر میں علالت شدید ہے خود رفو چکر ہو گئے اور بڑی دیر کے بعد جب لوٹے تو کلیم کا یہ حال کہ طبیعت اندھیرے سے متوحش۔ لیکن چراغ کی فرمائش پر مرزا صاحب کا یہ برجستہ فقرہ کہ:

''چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جائیں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جیے گا اور ابابیلوں کی کثرت ہے، روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہو جائیں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔''

کلیم غریب بھوک کی شدت سے الگ بے حال ہو رہا تھا اور زبان کو توفیق تو کیا ہوئی لیکن آنتیں برابر قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ منھ پھوڑ کر کھانے کی فرمائش کی... مرزا نے کیا خوب لقمہ دیا:

''مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہ کہا، اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جس کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ گھر میں آج آگ تک نہیں سلگی، مگر ظاہراً تو تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے، ایک تدبیر سمجھ میں آئی کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے ہاں سے گرم گرم چنے کی دال بنوا لاؤں، بس ایک دھیلے کی مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہو گی۔''

خیر صاحب وہ دھیلے کے گرما گرم چنے لے آئے۔ لیکن ان کی شان نزول میں جو تقریر دلپذیر مرزا کے کام و دہن سے ارشاد ہوئی۔ وہ عجب نہیں جو چھدامی بھڑبھونجے کو اردو کی دنیا میں زندۂ جاوید بنا دے:

''یار ہو تم خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو کیسے

بھلس رہے ہیں اور سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے جس کا بس بیان نہیں ہوسکتا تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن یہی کمال بھی کیا چیز ہے دیکھیے اتنی تو رات گئی ہے مگر چھدامی کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے، بندہ نے بہ تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے فاصلے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلاناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے۔''

کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا، ایسے خوبصورت، خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانے پر خراش تک نہیں ہے، ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھیے کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی، غرض دونوں رنگ خوشنما۔''

مولانا کا قلم مسرت وانبساط ہی کی منظر نگاری کا دھنی نہیں۔ غم وحسرت، حزن وملال، عبرت و موعظت کی بھی مرقع کشی میں ویسا ہی برق ہے۔ نصوح کا خواب تو اثر اندازی اور عبرت انگیزی میں اپنی مثال آپ ہی ہے، لیکن کلیم جب لٹ لٹا کر رات کو کوتوالی میں بند ہوا ہے اور بعد نماز فجر دو سپاہیوں کی حراست میں تحقیق حال کے لیے نصوح کی خدمت میں لایا گیا ہے اور اس کی آنکھیں ایک طرف باپ سے دو چار ہوئی ہیں اور دوسری طرف ان نمازیوں سے جو ابھی کل تک اس کی نظر میں حقیر و ذلیل قل اعوذیے اور مردہ شو اور ٹکڑ گدے تھے، تو وہ منظر بھی اردو ادب کے مؤثر و دل گداز نمونوں میں مستقل جگہ پانے کے قابل ہے۔ اقتباس پر اقتباس کہاں تک دیے جائیے اور کلیم کی ٹریجڈی یا داستان ورد کو کہاں تک سمیٹتے اور کہاں تک پھیلاتے چلے جائیے:

وقت کو تاہ قصہ طولانی

کلیم کی بقیہ سرگزشت کا ایک ایک جز، لفظ و معنی، ادب و اخلاق، ہر اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے، خصوصاً کلیم کی رئیس دولت آباد کے دربار میں حاضری اور اس موقع پر نائب صاحب سے پر لطف، دل آویز اور سبق آموز سوال و جواب اور پھر اس دردناک افسانے کی تمت بالخیر۔ لیکن اب جس کسی کو یہ شوق پورا کرنا ہو، وہ اصل کتاب ہی کا مطالعہ کرے۔

خاتمہ سے قبل بس ایک بات اس بے علمے نقاد کی زبان سے اور سُن لیجیے نذیر احمد زباندان تو خیر تھے ہی، ساتھ ہی زبان آور بھی تھے، زبان دانی کے نمونے آپ دیکھ چکے، اب زبان آوری کا

بھی ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو اور اس کے بعد، نصوح کے خالق کا غذی کے حق میں فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیجیے۔

موقع یہ ہے کہ ایک جگہ ایک بے دین یا بے خدا شخص سے گویا مولانا کی مڈ بھیڑ ہو گئی ہے۔ مارے پھبتیوں کے اسے بولا دیا ہے:

''بے دین آدمی ایسا ہے، جیسا بے نکیل کا اونٹ، بے ناتھ کا بیل، بے لگام کا گھوڑا، بے ملاح کی ناؤ، بے ریگولیٹر کی گھڑی، بے شوہر کی عورت، بے باپ کا بچہ، بے لالی کی مہندی، بے خوشبو کا عطر، بے باس کا پھول، بے طبیب کا بیمار، بے آئینہ کا سنگھار، یعنی دین نہیں تو دنیا و ما فیہاست ہیچ اور عبث اور فضول اور پوچ اور لچر''۔

◆◆◆

باب پنجم

دلّی والوں کے نام خطوط اور پیامات

خطوط نگاری اپنے اسلوب مضامین وجذبات کے تنوع اور علم وادب کی بہترین معلومات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتی ہے بشرطیکہ ان کا لکھنے والا احساس دل اور شگفتہ انداز بیان رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے وہ کامیاب مکتوب نگار تھے۔ انھوں نے بلامبالغہ ہزار ہا ہزار خطوط لکھے جن میں علمی وادبی شان کے ساتھ انشا پردازی کا حسن بے پایاں پایا جاتا ہے۔ ان میں بلا کی سادگی اور بے تکلفی پائی ہے۔ ضلع جگت اور رعایت لفظی سے خوب کام لیا گیا ہے۔ یہ خطوط ایجاز واختصار کے ساتھ حقیقت پسندی، حق گوئی، صحیح ٹکسالی زبان، اسلام اور مسلم ثقافت سے گہری وابستگی اور طلب علم کی سچی لگن کی لاجواب خصوصیات سے مالا مال ہیں۔

ان کے تعلقات اور مراسلت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ کوئی مجلسی آدمی نہ تھے، سیاست سے الگ تھلگ اپنے وطن دریاباد کے گوشۂ عافیت میں بیٹھے علمی وادبی مشاغل میں منہمک رہتے تھے۔ لیکن خطوط کے ذریعہ نصف ملاقات اور عام معلومات کے خوشگوار فوائد حاصل کرتے رہتے تھے۔ ان کی ڈاک میں متعدد خطوط عالموں، ادیبوں، شاعروں، طالب علموں اور مختلف انداز فکر وزندگی کے افراد واداروں سے آتے تھے جن کا وہ بڑی پابندی اور مستعدی سے مختصر مگر جامع وکافی جواب لکھا کرتے تھے۔

اردو ادب میں غالب کے خطوط تقدم زمانی کے ساتھ مقبولیت کے اعتبار سے مشہور ومعروف

ہیں لیکن مولانا مرحوم کے خطوط تنوع اور شگفتگی کے لحاظ سے اعلیٰ ادبی درجہ رکھتے ہیں، یہاں ان کے ادبی خطوط کا انتخاب دیا جارہا ہے جو انھوں نے اپنے دتی کے رفیقوں اور دوستوں کو لکھے۔

خطوط کی شکل میں انھوں نے مختلف موقعوں پر پیامات افراد، اخبارات و رسائل کو بھیجے جن میں ادبی لطافت اور جامعیت پائی جاتی ہے، نیز بہت سے مؤثر تعزیتی خطوط بھی بھیجے جن میں اظہارِ غم، ہمدردی کے ساتھ صبر، تسلّی کے اسلامی پہلو خاص طور پر نمایاں کیے گئے ہیں۔ ان خطوط سے بہت سی مفید معلومات اور اس سے بڑھ کر طلب علم اور تحقیق کی جستجو کی لگن میں اضافہ ہوتا ہے۔

دہلی سے متعلق کچھ دلچسپ شذرات بھی اس باب میں شامل کیے گئے ہیں۔ نیز ان کے مکتوبات کے اقتباسات اور پیامات بھی شامل ہیں۔ مکتوب الیہم کی لمبی فہرست میں سے کچھ نام دیے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، خواجہ محمد شفیع دہلوی، رازق الخیری صاحب، ایڈیٹر عصمت، مولوی عبدالحق صاحب، شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی، سید ہاشمی فرید آبادی، بشیشور پرشاد منور لکھنوی، راج نرائن راز، خواجہ غلام السیدین، شہباز حسین ایڈیٹر آجکل، مالک رام، گوپال متل، ڈاکٹر تاراچند، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر سید محمود، مولانا عثمان فارقلیط، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، سید آل عبا آوارہ، گوپی ناتھ امن وغیرہ۔

ان مکتوبات میں سے چند کے مختصر اقتباسات یہاں پیش کیے جارہے ہیں:

خواجہ محمد شفیع دہلوی

دتی کے مشہور صاحب زبان خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ایک خط میں مولانا سے میر حسن دہلوی کی مثنوی کے بعض اشعار و الفاظ کے معنی پوچھے تھے اس کے جواب میں انھوں نے لکھا ''واچھڑے قدیم زبان میں کلمہ دادو تحسین یا کلمہ استعجاب تھا۔ موترے یا موتھڑے گھوڑوں کے پیر کی بیماری کو کہتے ہیں۔ 'سرسائی' سر پر وار کرنے کو کہتے ہیں اور گھاتیاں اڑانا پٹے بازوں کی اصطلاح میں کسی معین ضرب کا نام ہے۔ ''بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم'' کا مطلب مجھ پر بھی واضح نہ ہوا۔ لکھنؤ میں ایک صاحب شیخ ممتاز حسین جونپوری پرانے ادیب اور خوش نویسی کے ماہر ہیں ان سے لکھ کر دریافت کرتا ہوں۔ ''مثلق'' عاملوں کی زبان میں ایک نقش کا نام ہے جس میں نو خانے ہوتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے ادبی معاملات پر مراسلت رہتی تھی چنانچہ ایک خط میں اردو لغت کے بارے میں ان کو لکھا: 'تازہ'' اردو'' رسالہ پیش نظر ہے۔ مقالہ فاضلانہ جدید اردو لغت' کا کیا کہنا مقالہ نگار کی شان علم و مرتبہ تحقیق کے مطابق، اجازت ہو تو دو ایک معروضات اپنی بساط کے مطابق پیش کروں۔

'نفائس اللغات' ہی کے طرز پر ایک اور لغت لکھنؤ میں تصنیف ہوا تھا۔ امجد علی شاہ کے زمانہ میں۔ نام انفس النفائس مصنف میر حسن لکھنوی سال تصنیف 1464 ہجری۔ جلال لکھنوی کی سرمایہ زبان اردو 1301 ہجری سید احمد دہلوی کی 'لغات النساء' 1917، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنؤ کی لغات اور خود انجمن ترقی اردو کی شائع ہوئی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران چار جلدوں میں قابل ذکر و توجہ ہیں۔ نیر لکھنوی کی بازاری زبان و اصطلاحات پیشہ وران اور ہاں میر کی محاورات زندگی بھی کار آمد ہے، آپ کی نگرانی میں کتاب انشاء اللہ قابل دید ہوگی۔

خواجہ غلام السیدین

خواجہ غلام السیدین صاحب نے مولانا کو عربی کی سند فضیلت ملنے پر 1967 میں مبارکباد کا خط لکھا اس کا جواب: '' شاعر تو سخن شناس کی داد پر پھولا نہیں سماتا، اس بے ہنر کو ایک ہنر شناس کی داد و تحسین پر الٹی شرمندگی ہوئی، اللہ نے کس غضب کا حسن ظن بعض دلوں اور دماغوں میں رکھ دیا ہے۔ ایک زمانہ میں آپ کے والد ماجد خواجہ غلام الثقلین صاحب کا عملاً مرید رہ چکا ہوں۔ آپ کے بڑے چچا کی تحریروں کا بھی بڑا مداح اور شیدائی رہا۔ ابھی کئی دن ہوئے آپ کا مضمون سفر ارتقاء نظر سے گزرا۔ ماشاء اللہ کچھ اور بھی لکھتا مگر وہ بات 'من ترا حاجی بگویم' یاد پڑ گئی۔

ایڈیٹر رسالہ '' آجکل'' دہلی کے مدیر شہباز حسین صاحب نے مولانا سے ان کی زندگی کے حالات پر ایک مضمون کی فرمائش کی، اس کا یہ جواب بھیجا گیا: '' حکم نامہ پہنچا۔ حیرت ہی ہوگئی۔ ایک بے کمال کیسے باکمالوں کی بزم میں قدم رکھے اور اپنی داستان حیات 'ہنر مندوں' کو سنائے لیکن بہرحال فرمائش ایک شہباز کی زبان سے ہوئی ہے۔ کنجشک غریب میں تاب و توانائی کہاں کہ

سرتابی کرے۔ تعمیل انشاءاللہ جوں توں ہو کر رہے گی ہفتہ عشرہ کی مدت میں"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط

مخدوم ومحترم! ظفر حسین خاں کی کتاب مآل معیشت پر جو پانچ ہزار کی گراں قدر رقم کا انعام عطا کیا گیا ہے اس پر اپنی دلی داد اور مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کتاب علمی وسنجیدہ حکیمانہ اور مذہب واخلاق کا پہلو لیے ہوئے اور مصنف میرے قدیم مخلص اور کالج کے ساتھی ہیں اور آخر میں یہ کہ یہ کتاب یکے از مطبوعات دارالمصنفین ہے (ادارہ مذکور کی خدمت کا شرف سید صاحب مرحوم ومغفور [یعنی علامہ سید سلیمان ندوی] کے بعد اب اس بے علم ہی کو حاصل ہے) اور ایسی قدردانی محال تھی اگر وزارت تعلیم کے عہدے پر کوئی اور ہوتا۔ دعاگو

مولانا حفظ الرحمٰن کے نام ان کے الیکشن جیتنے کی مبارکباد

انّا فَتحنا لکَ فَتحاً مُبیناً

آیت گو مجازی رنگ میں ایک امتی کے حق میں آج از سر نو نازل ہوئی۔ فتح مبین پر مبارکباد پیش کرنے کے لیے یہ نامہ تبریک آپ کو لکھ رہا ہوں، اللہ آپ کے وجود سے ملک کو زیادہ سے زیادہ اور ملت کو نفع پہنچائے۔

جگن ناتھ آزاد کے نام ان کے والد تلوک چند محروم کے انتقال پر تعزیتی خط

سن کچھ بھی ہو جائے سایۂ پدری سے محروم ہو جانا ہے بڑی مصیبت کی چیز اور کڑی آزمائش کی گھڑی، بڑی بےفکری باپ کے دم سے رہتی ہے۔ اپنے رنگ میں کہتے بھی خوب تھے اور کلام پختگی کی شان رکھتا تھا۔ اللہ آپ اور سارے عزیزوں کے دل کو تسکین دے۔

مولانا فارقلیط ایڈیٹر الجمعیۃ کے نام غلط ترجمہ کے بارے میں

آپ کے اخبار میں Misbehaved کا ترجمہ برابر غلط نکلنے لگا ہے مرد وزن کے سلسلہ میں جب بھی یہ لفظ آئے گا ترجمہ زناکاری، حرام کاری یا منھ کالا کرنا ہوگا۔ بدسلوکی اردو میں بالکل دوسرا ہی مفہوم رکھتی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی صحت میں ہر وقت دھیان لگا رہتا ہے۔

عبداللطیف اعظمی جامعہ کے نام ایک لفظ کی تحقیق کے بارے میں خط

جی میں ادیب ودیب تو کیا بزرگ ترین بلکہ خوردترین بھی نہیں۔ رسالہ جامعہ میں عش عش کی بحث میں نے دلچسپی سے پڑھی اور استفادہ بھی کیا۔ میرا معمول عش عش لکھنے کا ہے۔ رشک کی نفیس اللغات کی ردیف الف میں مطبوعہ موجود ہے۔ اشتقاق کی بحث زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اصل سوال فصحا اور شرفائے ادب کے تعامل کا ہے۔ اس بحث سے معلوم ہوا کہ دوسرے فریق کے دلائل بھی خاصی قوت رکھتے ہیں۔ ایسے موقع پر توسع اختیار کرنا چاہیے جیسا تذکیر وتانیث کی بحث میں ہوتا ہے۔ اس لیے میں توع سے بدستور لکھے جاؤں گا، لیکن عش عش کی طرح اش اش کو بھی جائز سمجھوں گا۔

ڈاکٹر قمر رئیس صدر شعبہ دہلی یونیورسٹی کے نام خط

مرزا رسوا کے مضمون کی نقل کی اجازت بمسرّت تمام ہے۔ آپ نے خوب طلسم اسرار کے پہلے ایڈیشن کا پتہ لگالیا۔ جب ملیے گا تو اس کی شکل دکھادیجیے گا۔ میرا نسخہ افشائے راز بمسرت تمام آپ دیکھ سکتے ہیں، آپ جب بھی لکھنؤ آئیں وہیں مل جائے گی۔ یہ دہلی میں لکھنؤ روڈ پر رہ کر آپ نے دہلی میں بیٹھے بیٹھے لکھنؤ سے مناسبت خوب پیدا کرلی۔

اپنے اسکولی ہم جماعت سید آل عبا مارہری آوارہ کے نام خط

'' آوارگی کے پردہ میں یہ ردائے آل عبا خوب نکلی، سبحان اللہ ع ہماری کم نگاہی تم کہاں تھے ہم کہاں سمجھے۔ دل نے کہا ابھی فرقۂ 'ملامتیہ' زندہ ہے۔ کل 10 جولائی کو ضرور آپ کی پیش کردہ ''بی بھٹیاری'' سے دل بہلاؤں گا اور آپ کے اسٹیشن ڈائریکٹر کو اپنے تاثرات بھی بھیجوں گا''۔ مولانا دریابادی حضرت آوارہ کی ٹکسالی وشستہ زبان کے بڑے قائل تھے۔

◆◆◆

پیامات

دہلی کی مختلف شخصیتوں کے متعلق مولانا مرحوم کے کچھ پیامات کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔
روزنامہ "سیاست جدید" کانپور کے رفیع احمد قدوائی نمبر کے لیے حسب ذیل پیام بھیجا گیا:

مقام رفیع

ہندوستان کی تازہ تاریخ میں جو مقام رفیع، رفیع احمد قدوائی کو حاصل ہے اس سے انکار کسی دشمن کے لیے بھی ممکن نہیں۔ دل خوش ہوا کہ اس کا اعتراف سیاست جدید اپنا ایک خصوصی نمبر نکال کر آرہا ہے۔ ایک سیاسی مخالف کی عظمت کا اعتراف خود ادارہ سیاست جدید کی شرافت کا ایک عملی ثبوت ہے۔

اپنی دوسری بے شمار خدمات کے علاوہ مرحوم نے ہندوستان کے ایک پیچیدہ ترین مسئلہ رزق کو جس طرح حل کر دکھایا اور رازق مطلق کے نائب کی جو تجلی اس عالم ناسوت میں دکھادی، اس لحاظ سے اگر انھیں 'میکائیل ہند' کہا جائے تو بجا ہے۔

حسرت آیات ایسی ہی وفات کو کہا جا سکتا ہے۔

جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن مولانا کی انشا پردازی کے بڑے قائل تھے۔ 1956 میں انھوں نے مولانا کو خط لکھ کر ان کے ڈرامہ "زود پشیمان" کو اسٹیج کرنے کی

اجازت مانگی اور اس کے لیے مولانا سے پیام بھیجنے کی فرمائش کی۔ زود پشیماں مولانا نے نوعمری اور زمانۂ الحاد میں لکھا تھا اور بعد میں اس کو دور جہالت کی یادگار قرار دینے لگے تھے چنانچہ انھوں نے جواب میں لکھا: ''آپ کا خط پا کر آپ کی ستم ظریفی کا قائل ہوگیا۔ تھیٹر کو فروغ دینے کی کوشش میں ترغیب وتحسین کی توقع مجھ دقیانوسی ملّا مدیر صدق سے :

عشق و مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب

کہیں میرے پیام کو اپنے کسی COMIC کے اشتہار کا جز بنانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ زود پشیماں بالکل نوعمری کی تصنیف ہے اور وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ۔ شیکسپیر کا نشہ اس وقت سوار تھا اور دو چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں، اب اگر کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فیصد بدل ڈالوں گا۔ ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر ہی سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں''۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے خواجہ حسن نظامی ثانی نے اپنے نامور والد کی انشا پردازی کے متعلق اپنے رسالہ منادی کے لیے ایک مضمون مولانا سے مانگا جس کے جواب میں یہ پیام بھیجا گیا:

البیلا انشا پرداز

خواجہ صاحب کی بزرگی وزرگی کا حال تو کوئی بزرگ ہی بتا سکتا ہے اپنا ایمان تو ان کی انشا پردازی پر ہے۔ صاحب قلم یا انہی کی زبان میں قلم کار کی حیثیت سے فرد تھے اور اس کی شہادت یہاں سے لے کر آخر تک دے سکتا ہوں کہ ان کا سا البیلا انشا پرداز نہ ان کے زمانہ میں پیدا ہو سکا اور نہ آج تک پیدا ہوا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں انشا پرداز تھے۔ ساز سے زیادہ سوز کے مالک اور اس سے بڑھ کر تاریخ ادب پر کوئی ظلم نہیں کہ کتابوں پر کتابیں اور مقالوں پر مقالے نثر اردو کے ماہرین پر تیار کر دیے جائیں اور ان میں مرحوم کا نام بھی نہ آنے پائے۔

اپریل 1957 میں پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے یوم اردو کے لیے مولانا سے پیام کی فرمائش کی جس کے جواب میں یہ پیام بھیجا گیا:

یوم اردو اور وہ بھی خوب دھوم دھام سے ایک نہیں بیسوں مناتے جایئے اور اپنے دل کو بہلاتے رہیے لیکن اس کی آس نہ لگایئے کہ اس سے کچھ ہونا ہے یا ہوگا یا آپ کی دادفریاد کی شنوائی بھی کہیں ہوگی۔ جو کچھ اپنے بس میں ہے اسے کیے جایئے اور اس کے آگے:

کشتی خدا پر چھوڑ دے لنگر کو توڑ دے

کوئی جان سکتا تھا کہ نسیم وسرشار، موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو، چکبست اور منوہر لال زتشی کی زبان کو یوں اس کے وطن یوپی سے دیس نکالا مل جائے گا اور کیا جواہر لال اور کیا کیفی اور کیا کول سب منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔

ان ہی اردو کے مشہور شاعر گلزار دہلوی کی شادی کے موقع پر اپریل 1958 پر مولانا نے یہ پیغام بھیجا:

گلزار سلمۂ اردو کی برات کے دولھا تو پہلے ہی سے تھے مبارک ہو اب مجاز واستعارہ کی دنیا میں نہیں۔ عالم اجسام کی ٹھوس اور مادی دنیا میں بھی نوشہ بن رہے ہیں۔ گلزار کے سہرے کے پھول کھلنے ان کے والدین، عزیزوں، مخلصوں بلکہ سارے اردو والوں کو مبارک ہو۔

ان کا گھر چشم بد دور شعروادب کا ایک کھلا ہوا چمن اور لہلہاتا ہوا لالہ زار ہے، ان کی ہستی اس بات کا ثبوت ہے کہ نسیم اور سرشار، چکبست اور کیفی کی قوم آج بھی اپنے بزرگوں کے ورثہ سے محروم نہیں۔

علامہ راشد الخیری مرحوم کے صاحب زادے رازق الخیری ایڈیٹر رسالہ عصمت نے جوبلی نمبر کے لیے پیغام مانگا تھا جس کا جواب یہ گیا:

ہوش کی آنکھیں جب سے کھلیں عصمت کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا، مدتوں آنکھوں نے نور اور دل نے سرور حاصل کیا۔ خاتون مشرق کہاں سے کہاں پہنچی، آفریں ہے آپ کی ہمت پر کہ آج بھی وہی پرانی صدا لگائے چلے جا رہے ہیں اور بیڑا اسی کا اٹھائے ہوئے ہیں کہ ''چراغ خانہ کو کسی حال میں شمع انجمن نہ بننے دیں گے''۔

چراغ لے کر کہاں سامنے ہوا کے چلے

اللہ آپ کے دم کو قائم رکھے اور آپ کے دم خم کو بھی جیتے رہیے اور اسی آن بان، اسی قلندرانہ

شان سے اپنے میدان جہاد میں جمے رہے ڈٹے رہے۔

رسالہ ''اردو ادب'' کے مولانا آزاد نمبر کے لیے یہ پیام مولانا نے بھیجا:

''اردو ادب'' نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں جو خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے ہر طرح قابل مبارکباد و تحسین ہے۔ اس سے کم سے کم ایک ظلم کی کسی حد تک تلافی ہوجائے گی۔ ادھر اردو ادب کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ آزاد نامی ایک عظیم ادیب و انشا پرداز کی کوئی ہستی موجود ہی نہیں، یہ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے۔ یہ ظلم اور بھی صاحبوں کے ساتھ ہوا ہے لیکن مظلوم اعظم مولانا آزاد ہی ہیں۔ ان کی ادبی اور انشائی خدمات کا اگر آپ کے رسالہ نے صراحت و تفصیل سے جائزہ لے لیا تو گویا ایک ادبی فرض کفایہ ادا کردیا اور تاریخ ادب کے دامن سے ایک بدنما دھبہ کو دور کردیا۔ مولانا کی انشاء کے مختلف دور قائم کرنے اور شبلی اسکول سے ان کا تعلق واضح کرنا ضروری ہے۔

سید ہاشمی فرید آبادی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی جوبلی کے لیے پیام مانگا تھا اس کا یہ جواب مولانا نے دیا:

''بابائے اردو کی خدمات زبان و ادب پر کچھ لکھنا لکھانا ''سورج کو ہے چراغ دکھانا''۔ جو چیز خود ہی آفتاب کی طرح روشن ہو اس پر کوئی روشنی کہاں سے لاکر ڈالے گا۔ یہ عظیم الشان تناور درخت جس کا نام انجمن ترقی اردو ہے خوب یاد ہے ایک زمانہ میں کچھ بھی نہ تھا۔ یہ سارا فیض ایک ہی ذات کی ان تھک آبیاری کا ہے۔ سیاسی، علمی، لسانی ہر محاذ پر یہی اردو کے لیے لڑائیاں لڑے اور میدان پر میدان مار لیے۔ بس ایک ہی دھن ہے خدمت اردو کی جوان کی زندگی کی رگ رگ میں بسی ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کی ہمت کو جو جوانوں کو شرمائے ہوئے ہے ہمیشہ ہی جوان رکھے''۔

غالب اکیڈمی بنارس نے یوم غالب منایا، اس کے لیے مولانا نے یہ پیام خیر بھوروی صاحب سکریٹری اکیڈمی کو بھیجا:

غالب کی قدر کرنا خود اپنی سخن شناسی اور حسن ذوق کا ثبوت دینا ہے۔ اہل بنارس قابل

مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس ''کارِ خیر'' کو یاد رکھا۔

اردو کے خوش گو شاعر منشی بشیشور پرشاد منور کے یوم کے لیے یہ پیام راج نرائن راز نئی دہلی کو یہ پیام بھیجا گیا:

منور صاحب ماشاء اللہ شاعر ابن شاعر ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ ان کا گھرانا ہی شعروشاعری کا گھرانا ہے۔ پہلے لکھنوی تھے اب دہلوی ہو گئے۔ آنکھیں کھولیں تو زبان وادب کے ایک مرکز میں، اب چل پھر رہے ہیں، اٹھ بیٹھ رہے ہیں تو زبان کے دوسرے مرکز میں۔ آغاز بھی مبارک انجام بھی مبارک۔ کلام نام روشن کیے ہوئے۔ خالی منور ہی نہیں روشن بھی اور دوسروں کے لیے روشن بخش بھی۔ اب شمار استادوں میں ہے۔ جیتے رہیں کہ ان کے دم سے خدمت اردو کی ایک روایت کہن زندہ وتازہ ہے۔

دلّی کے طبیب اعظم اور مشہور قومی وملّی لیڈر حکیم اجمل خاں کی برسی طبیہ کالج پٹنہ میں 1959 میں منائی گئی جس کے لیے مولانا نے یہ پیام بھیجا:

> ''اجمل خاں کے ذکر جمیل سے اپنے کو تر زبان رکھنا خود اپنی خوش ذوقی اور احسان شناسی کا ثبوت دینا ہے اور اس کا اعلان کرنا ہے کہ آپ کا ادارہ حذاقت فن کا بھی قدردان ہے اور شرافت نفس وصحیح انسانیت کا بھی۔ مرحوم کا مونوگرام کاغذات پر چھپا تھا۔ افضل الاشغال خدمت الناس۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پر بھی کندہ تھا، خدمت خلق میں دن رات لگے رہنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جلسہ یادگار کی صدارت کے لیے بھی انتخاب ڈاکٹر ذاکر حسین کا خوب رہا، جمال شرافت سے اسی طرح آراستہ وپیراستہ''۔

حکیم صاحب کی یادگار اگر اخلاص سے منانا ہے تو خصوصی توجہ ان تین چیزوں پر لازمی ہے:

1۔ ان کے مدرسہ طبیہ دہلی کی ہر طرح تعمیروترقی انھیں کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر

2۔ ہندو مسلم اتحاد کا فروغ گاندھی جی کے قائم کیے ہوئے خطوط پر

3۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فلاح وترقی اس کی قدیم خصوصیات کے ساتھ۔

یوم افق پر یہ پیام منور لکھنوی کے نام جولائی 1964 میں بھیجا گیا:

''افق صاحب کا نام نامی کان میں اس وقت پڑا جب میں اسکول کے ساتویں آٹھویں درجہ میں تھا، ان کی نظم غالباً کوئی شہرآشوب قسم کا مسدس کورس میں تھا جس کے دو مصرے اب بھی حافظہ میں رہ گئے ہیں:

دوشالہ اوڑھ کر چلے ہیں فصل گرما میں
ہے شربتی کا انگرکھا بدن پر سرما میں

جب ذرا بڑا ہوا تو ''اودھ اخبار'' میں ان کے مضمون پر مضمون دیکھنے میں آئے اور ان کی قدرت کلام کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اس سربرآوردہ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے۔

مشہور یہ تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، اس کلیہ کی تردید میں ایک ہجوم جس طرح کشمیری پنڈتوں نسیم، سرشار وغیرہ کا تھا اسی طرح دوسری طرف کائستھ برادری کی صف اول میں ایک جوالا پرشاد برق تھے اور دوسرے یہی دوارکا پرشاد افق۔ حضرت افق کی خوش نصیبی تھی اپنا جانشین اپنے فرزند سعید اور شاگرد رشید کو چھوڑ گئے جو ہر طرح ان کے کام کی تکمیل کرنے والے اور ان کے نام اور یاد کو منور رکھنے والے ہیں۔

◆◆◆

شذرات

دلی کے متعلق کچھ شذرات پیش ہیں:

<u>بھارت کی سیر</u>

اسٹیٹسمین 29 نومبر 1955 میں اس کے نئی دہلی کے کالم نگار کے قلم سے:

"پیرس سے آئے ہوئے ایک دوست نے جن کے پاس ٹھہرنے کے لیے کل 24 گھنٹے تھے مجھ سے فرمائش کی کہ اتنی سی دیر میں انھیں دہلی کی یادگار سیر کرادوں۔ میں انھیں لے کر نہ قطب مینار گیا نہ لال قلعہ اور نہ کسی کناٹ پلیس کے ریسٹورنٹ میں۔ میں نے کہا بس آج رات میں جامع مسجد کی سیر رہے گی۔ چنانچہ ہم روانہ ہوئے اور دریا گنج میں سواری سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ جامع مسجد آگئی اور ہم سیڑھیوں پر چڑھے جن پر مخلوق جمع تھی۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں ایک صاحب کسی ولی اللہ کی مناجات سستے داموں میں فروخت کر رہے تھے اور بھی کئی سودے والے تھے۔ میرے دوست نے جب اس ٹڈی دل ہجوم کو دیکھا جو چاندنی چوک سے آ جا رہا تھا اور یہاں سے راشٹر پتی بھون کا بھی کچھ دھندلا سا نظارہ ہو رہا تھا تو وہ بالکل مسحور ہو گیا اور بولا یہ شام یادگار رہے گی۔ اب ہم سیڑھیوں سے اترے اور ان دوکانوں کے سامنے سے گزرے جہاں زری کے کام کے کپڑے، چادریں، زرتار کلاہیں، چپلیں بک رہی تھیں، یہاں تک کہ مشہور کبابیے کی دوکان پر جا پہنچے۔ آپ کی قطع یہ تھی کہ کچی مٹی کے چبوترے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے سامنے کوئلے دہک رہے تھے اور ان پر کباب بھن رہے تھے۔ ہر طرف سے بے پروا یکسوئی کے ساتھ آپ سیخوں پر گوندھا ہوا قیمہ چڑھا رہے تھے۔ گھسی پٹی میز کے گرد لوہے کی کرسیوں پر ہم تین آدمی بیٹھ گئے اور کباب پراٹھے اڑاتے رہے۔

قیمت تین آدمیوں کے لیے کل ایک روپیہ سے زائد دینا پڑی"۔

یہ کالم نگار صاحب ہوں جس قوم کے بھی، بہر حال ہیں بڑے ستم ظریف۔ پیرس والے دوست کو بھارت کی راجدھانی کی سیر کرائی بھی تو کہاں کی؟ جامع مسجد اور اس کے ملحقات کی، اور کھلایا بھی کیا؟ کباب اور پراٹھے۔ اور اپنے اس کارنامے کو مزے لے لے کر شائع بھی کر دیا۔ اب وہ سیاح غریب اگر پیرس میں جا کر یہ شائع کرے کہ اگر بھارت میں دیکھنے کی کوئی جگہ ہے تو وہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے اور کوئی کھانے اگر کھانے کے قابل ہیں تو وہ مسلمانوں کے دسترخوان ہیں۔ غرض یہ کہ وہ بیچارہ مسلم ہی کلچر کا کلمہ پڑھتا ہوا اپنے ملک واپس پہنچے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ (صدق جدید 16 دسمبر 1955)

مغلئی دسترخوان

نرگسی کوفتے، مرغ مسلم، بریانی مرغ، کشمشی پلاؤ، دَم پخت، تندوری، یہ مغلئی عہد کے لذیذ کھانوں کی فہرست کہاں کی پیش ہو رہی ہے۔ یقیناً ماضی کے کسی شاہی یا نیم شاہی دسترخوان کی ہوگی۔ جی نہیں! اسی دسمبر کی 11 تاریخ کا ذکر ہے کہ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند کی کوٹھی پر جو میز صدر امریکہ کی ضیافت کے لیے لگی اس پر عہد مغلیہ کی طباخی کے یہ نمونے پیش ہوئے اور معزز مہمان نے مزے لے لے کر شاہی رکاب داروں کے فن کی داد دی۔ جواہر لال اور کسی چیز میں اپنے والد محترم کے جانشین ہوں یا نہ ہوں اپنی حسن ظرافت اور خوش خوری میں تو انھوں نے پوری طرح پنڈت موتی لال نہرو کی یاد تازہ کر دی۔ (صدق جدید 25 دسمبر 1959)

شہید حق پرستی

(گاندھی جی کی تعزیت)

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

گاندھی جی رخصت ہو گئے، دنیا جنھیں مہاتما اور دیوتا سروپ اور خدا معلوم کن کن تعظیمی ناموں سے پکارتی تھی، اپنے ملک، اپنی قوم سے دم کے دم میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ وہ کسی گورے کی سنگین سے نہیں، کسی پاکستانی کی تلوار سے نہیں ایک ہندوستانی ننگِ ہندوستان، ہندوستانی ہی گولی کے فیر سے ہلاک ہو گئے، ایسی موت کو موت نہیں شہادت کہتے ہیں۔ شہادت اصطلاحی نہیں، شہادت جو حق پرستی کی راہ میں مظلوموں کی حمایت و نصرت کی راہ میں نصیب ہوتی ہے! سفاک قاتل کی گولی اس مشت خاک کے جسم پر نہیں چلی، عین انسانیت کے سینے کو چھلنی کر گئی!

گاندھی جی عقیدتاً نیم مسلمان ضرور تھے، توحید کے پوری طرح قائل و معترف، محمد رسول اللہ ﷺ

کو ملک عرب ہی کا نہیں ساری دنیا کا مصلح و معلم تسلیم کرنے والے، آپؐ کے نام اور کام دونوں کی نہایت عزت کرنے والے، قرآن مجید کو ترجموں کی مدد سے بار بار اور کثرت اور شوق سے پڑھنے والے اور اپنے عمل کے لحاظ سے تو اس وقت ہندوستان کی زندہ آبادی میں ہندوستان کے چار ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے سب سے بڑے پشت پناہ۔ ان کی اس شہادت سے ہندوستان پر بہ حیثیت مجموعی جو کچھ گزرے گی، تو وہ ہے ہی، خود مسلمانوں کی، یہ کہنا چاہیے کہ وہ کمر توڑ گئے۔ مسلمانوں کو ان کی چھنی ہوئی اور لٹی ہوئی مسجدیں دلا رہے تھے ان کے اندر سے مورتیوں کو وہ ہٹوا رہے تھے، مسلمانوں کی جان، ایمان اور عزت، مال سب کی حفاظت وہ اپنا دھرم سمجھے ہوئے تھے۔ بے گھر مسلمانوں کو پھر سے وہ گھروں میں آباد کرا رہے تھے۔ ہزار ہا لکھوکھا نیم جان مسلمانوں میں از سر نو جان وہی ڈال رہے تھے، جان انھیں مسلمانوں کی ہمدردی میں اور مسلمانوں ہی کی جانیں بچاتے ہوئے انھوں نے دے دی، اپنے کو قربان کر دیا تاکہ مسلمان محفوظ رہیں۔

آج جب وہ اپنے خون بہتے ہوئے جسم اور فاقہ سے زار و نزار بدن کے ساتھ اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے تو عجب نہیں کہ فرشتوں نے بہ ادب بارگاہِ قدس میں عرض کی ہو کہ دل کے اندر کے عقائد کا حال تو حضور والا ہی جانیں، اتنی شہادت ہم اور ہمارے ساتھ ناسوت کے بے شمار بندے بھی دے رہے ہیں کہ اس وقت آپ کی توحید کے پرستاروں اور آپ کے حبیبؐ امت کا سینہ سپر سب سے بڑھ چڑھ کر یہی بندہ تھا۔ اور جس جرم میں یہ قتل ہو کر آیا ہے وہ بجز مسلم دوستی کے اور کچھ نہ تھا۔

اندھیرے میں اجالا

ایک لمبی نظم ''بھارت کے مسلمان'' کے تین بند:

اس دور میں تو کیوں پریشان و ہراساں
کیا بات ہے کیوں متزلزل ترا ایماں
دانش کدہ دہر کی اے شمع فروزاں
اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے تو رہے ترساں

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو
نا محرم ہر جرأت رندانہ ہوا تو
آبادی ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو

تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو
ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے دن

ماحول کی یہ تازہ ہوا تجھ کو گوارا
درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا
کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا
چمکے گا پھر ایک بار ترے بخت کا تارا
ہوجائے گی تاریکی ماحول گریزاں

عبرت اور مسرت کے کانوں سے اس کو سن لیجیے کہ یہ نظم کسی مسلمان کی نہیں دلّی کے مشہور غیر مسلم شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کے قلم سے ہے۔ اس سرزمین پر جب تک اس طرح کے فراخ دل، بے تعصب وسلیم الطبع ہمسایوں کا وجود ہے مسلمانوں کو ہرگز مایوس ہونے کی وجہ نہیں اور بخت کا تارا اگر واقعی چمکا تو امید نہیں یقین ہے کہ ملّت اسلامی ایسے شریف ہمسایوں کے حقوق ہرگز نہ بھولے گی۔ (صدق جدید 8 فروری 1952)

آہ ابوالکلام!

آج وہ اٹھ گیا

1۔ جو اردو ادب و انشاء میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا۔ جس کا اس میدان میں کوئی سہیم و شریک نہیں تھا اور جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

2۔ جو اردو زبان کا ایک بہترین مقرر و خطیب تھا۔

3۔ جو مدتوں دین وقرآن کی خدمت اپنی بصیرت وادراک کے مطابق کرتا رہا۔

4۔ جو ملکی سیاسیات کی صف اول میں چالیس پینتالیس سال سے رہا تھا۔

5۔ جس نے اردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

6۔ جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی کہنا چاہیے آخری یادگار رہ گیا تھا۔

7۔ جو ایک پیکر شرافت تھا۔ جو 1947 کے بعد سے نہ معلوم کتنے بے سہاروں کا سہارا بنا رہا۔

اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت فرمائے۔

[1958 میں مولانا آزاد پر صدق جدید میں تعزیتی شذرہ]

◆◆◆